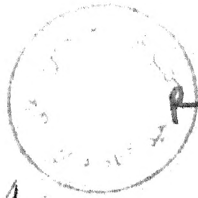


مشاہیرِ عالم

یعنی

جلیل القدر شخصیتوں کے مفصل حالات

مصنفہ

کے۔ اے حمید بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لاء

(مصنف اتاترک و مسلمانانِ عالم)

پبلشر:- محمد نصیر ہمایوں بی۔ اے

قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

۱۹۳۹ء

قیمت مجلد عہ

انتساب

رفیقۂ حیات زکیہ سلطانہ

کے نام

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست تصاویر

مقدّمہ

موجودہ زمانہ نے انگریزی زبان میں سوانح نگاری (بیوگرافی) کو ادب کی ایک مستقل صنف کا رتبہ بخش دیا ہے۔
انگریزی میں سوانح نگاری کا جدید انداز پرانے انداز سے بہت مختلف صورت اختیار کر چکا ہے۔ پرانے زمانے کا سوانح نگار جب کسی شخص کی سوانح عمری لکھنے بیٹھتا تھا تو محض اس امر سے سروکار رکھتا تھا۔ کہ اس کی پیدائش سے وفات تک کے واقعات بالتفصیل اور بلا تکلف بیان کرتا چلا جائے۔ کہیں کوئی متنازع فیہ واقعہ آجائے اور ضرورت سمجھے تو وہاں تسلسل کو چھوڑ کر مختلف بیانات اور دلائل پر بحث بھی کرے۔ اور جن حوالوں کو مستند اور مفید مطلب سمجھے۔ انہیں بیان کر ڈالے۔ یعنی اس کی تحریر کا مقصد محض افادی تھا۔ اس کی غرض اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتی تھی کہ جس شخص کی سوانح حیات لکھنے بیٹھا ہے۔ اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ صحیح معلومات لوگوں کو بہم پہنچا دے۔ ان سوانح نگاروں میں اگر اتفاق سے کوئی انشاپرداز ہوتا تھا تو اس کی کتاب میں اسلوب بیان کا لطف مستزاد ہو جاتا تھا۔ جسے تحریر پر قدرت نہ ہوتی تھی۔ اس کی کتاب محض واقعات کا خشک بیان بن کر رہ جاتی تھی۔

لیکن انگریزی کے جو مصنفین موجودہ زمانہ میں سوانح نگاری کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اس پرانے انداز سے بہت مختلف ہے۔ وہ ادب کو تاریخ پر مقدم سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ مورخ نہیں۔ بلکہ ادیب اور فن کار ہیں۔

ہر فن کار اپنے اپنے فن میں اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار کرتا ہے۔ ادیب اپنی تحریر میں اپنے ذاتی تصور کو اظہار بخشتا ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے ادیب، سوانح نگار اگر کسی شخص کی سوانح حیات لکھتے ہیں۔ تو اس خیال سے لکھتے ہیں کہ بحیثیت ایک فن کار کے وہ اس شخص کے حالات زندگی کو بطور ایک موضوع کے قابل قدر سمجھتے ہیں۔ ان کے تصنیف کے ڈھب ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی غرض زیادہ سے زیادہ معلومات بخشنا نہیں۔ بلکہ ایک فن کارانہ تاثر پیدا کرنا ہے۔ وہ واقعات پر

بحث کرتے اور دلائل اور حوالوں کے دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ وہ بحیثیت مجموعی سوانح حیات پر نظر ڈال کر ایک داستان سی مرتب کر لیتے ہیں اور پھر واقعات کو ایسی ترتیب اور ایسے تناسب سے بیان کرتے ہیں کہ وہ ان کی پیش کردہ تصویر میں زندگی کی روح پھونک دیں اور زیادہ سے زیادہ پرلطف معلوم ہو سکیں۔ علاوہ ازیں ان کی تحریر میں واقعات سے وہ بے تعلقی بھی نہیں ہوتی۔ جو ایک خالص مورخ کا خاصہ ہے۔ ان کی تمام داستان میں انکے انفرادی تصور کا رنگ پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہوتا ہے۔ یا ان کی انفرادی خوش طبعی جا بجا جھلکتی ہوئی نظر آتی رہتی ہے ۔

جدید انداز کے سوانح حیات کے ایک انتخاب پر لارڈ ڈیوڈ سیل نے ایک قابل قدر مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں اس موضوع پر دلچسپ اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ کہ اس نئے ڈھب پر سوانح نگاری کرنا آخر ہمارے ہی زمانے کے حصے میں کیوں آیا۔ کسی کو گذشتہ زمانہ میں اس کا خیال کیوں نہ سوجھا؟

وہ اس کی ایک وجہ تو یہ قرار دیتے ہیں کہ دوسری اصناف ادب میں طبع آزمائی کرنے کیلئے موجودہ زمانہ زیادہ سازگار نہیں۔ ہمارا زمانہ بہت نمایاں طور پر علمی زمانہ ہے۔ اس میں اہم ترین کام سائنسدان سرانجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ علمی تحقیق اس زمانہ کے غور و فکر میں نفوذ کر چکی ہے۔ مگر ایسا انداز فکر کسی تخلیقی فن کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا۔ یہ انداز فکر خشک اور محققانہ ہونے کے باعث جذبات کے خروش اور تخیل کی پرواز کا۔ جو شاعری کی روح رواں ہیں عنان گیر ہو جاتا ہے۔

لیکن اسے کیا کریں۔ کہ گذشتہ زمانہ کے لوگوں کی طرح آج کل کے لوگ بھی لکھنے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ ادب کی دوسری مناسب اصناف نکالنے کی کوشش کریں۔ اس نتیجہ میں سوانح نگاری بڑی سہولت سے انکے ہاتھ آگئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ موجودہ زمانہ کے علمی میلان سے ناموافق نہیں۔ اگر سوانح نگاری سے یہی کام لیا جا رہا ہے کہ ایک ذاتی اور شخصی تصور کا انکشاف کرے لیکن اس کے ساتھ ہی اس صنف کے لئے اظہار حقیقت سے گریز بھی کسی طرح ممکن نہیں۔ اور حقیقت کی ماہیت کے لئے علمی انداز فکر کو لازمی سمجھنا چاہئے۔ کسی انسان کی دل نشین

تصویر لفظوں میں پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ لکھنے والا تفصیلات کے مطالعہ و تحقیق و تفتیش میں ویسی ہی مہارت رکھتا ہو۔ جیسی مہارت کسی مرض کی صحیح تشخیص کے لئے ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ اپنے موضوع کا مطالعہ ایک عالمانہ بے تعلقی اور غیر جانبداری سے کیا جائے ٭

پرانے زمانے کا سوانح نگار جب لکھنے بیٹھتا تھا۔ تو اس کا غیر معمولی تعصب اسے اپنے موضوع کا مخالف بنا دیتا تھا یا موافق۔ غیر متعصب ہوتا تھا جب بھی نہایت قوی اخلاقی معیار اس کی رائے کو کچھ ایسا مسخ کر دیتے تھے۔ کہ وہ اپنے موضوع پر متعصبانہ انداز میں نظر ڈالنے لگتا تھا۔ لیکن سوانح نگار کا فرض بیان ہے نہ کہ فتوی دینا۔ کسی شخصیت کو واضح طور پر چشم تصور کے سامنے لے آنے کے لئے یہ بتانا ضروری نہیں کہ اس کے اعمال اچھے ہیں یا برے۔ اس قسم کی رائے زنی تو اس کی تصویر کے نقش ہوئے نقوش کو بگاڑ دالتی ہے۔ بتانے کی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اعمال اس سے سرزد کیوں اور کیونکر ہوئے۔ یہ انداز فکر بھی سائنسدان ہی کا ہے۔ سائنسدان کا کام یہ بتانا نہیں کہ مرض بری شے ہے اس کا تعلق مرض کے محض اسباب اور علامات سے ہے؟ یہ زمانہ جدید انداز کی سوانح نگاری کے لئے کیوں سازگار ہوا اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بمقابلہ پچھلے زمانے کے اس زمانہ میں ہم اس نوع کے غور و فکر کے لئے مسلح زیادہ ہیں۔ گذشتہ چالیس سال میں نفسیات نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ انسانی شخصیت کی۔ اسی کو تحریک دینے والی قوتوں کی اور وراثت اور ماحول کے اثرات کی ماہیت جیسی وضاحت سے آج سمجھی گئی ہے پہلے کبھی نہ سمجھی گئی تھی۔ چنانچہ انسانی کردار کا مکمل حال جس خوبی سے لکھنے والے آج بیان کر سکتے ہیں پہلے کبھی بیان نہ کر سکتے تھے ٭

ان سب امور کے ہوتے ہوئے بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ نئی قسم کے سوانح نگار صرف زمانہ کے تقاضے نے پیدا کر دیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو انسان ہی نئی ڈگر پر لگاتے ہیں۔ بعض مصنفین نے سوانح نگاری جدید انداز میں اس خوبی سے کی۔ کہ ان سے متاثر ہو کر دوسرے ان کی تقلید کرنے لگے۔ سوانح نگاری میں یہ مورخانہ انداز

عام تھا۔ کہ موضوع کو بحیثیت ایک فرد واحد کے پیش نظر نہ رکھا جائے۔ بلکہ عام واقعات پر اس نے جو اثر ڈالا۔ صرف اس سے واسطہ رکھا جائے۔ ان مصنفین نے اس انداز کو بالکل نابود کر دیا۔

جدید سوانح نگاری کی ترکیب کافی پیچیدہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ناول کی مانند ڈرامائی انداز رکھتی ہے اس کا موضوع حیات انسانی کا ڈراما ہے۔ پھر ناول کے مطابق موجودہ زمانے کی سوانح عمریاں نقش آفرین بھی ہوتی ہیں ان کے مصنف کوشش کرتے ہیں کہ اپنا ڈراما ہمارے خیال کی آنکھوں کے سامنے لائیں۔ ہمیں کرداروں کے چہرے دکھائیں۔ ہمارے سامنے اس ماحول کو پیش کریں جس میں ان کے کردار زندگی بسر کرتے تھے۔

یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن ناول نگاری کی نسبت سوانح نگار کا کام زیادہ ٹیڑھا اور پیچیدہ ہوتا۔ اس لئے کہ وہ از سرتا پا ایک سچی سرگذشت بیان کر رہا ہوتا ہے اور سچائی سے گریز کسی طرح کر نہیں سکتا۔ اسے واقعات اور کردار بنے بنائے ملتے ہیں۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے بس کی پوری کوشش کو کام میں لا کر انہیں صحت کے ساتھ پیش کرے اور نہایت محتاط رہے کہ وہ اسی اسلوب اور اسی اہمیت سے پیش ہوں۔ جو انہیں زندگی میں حاصل تھی۔ چنانچہ اس زمانے کے سوانح نگار کی تخلیقی تحریک کا اظہار ناول نگار سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ ناول نگار تو اپنا کمال زیادہ تر ایجاد کردار اور مناظر کی تخلیق کی قدرت میں ظاہر کرتا ہے۔ لیکن سوانح نگار اپنا کمال تشریح و توضیح میں اور اس بات میں کرتا ہے کہ وہ بنی بنائی کہانی میں معنی آفرینی کس حد تک کر سکتا ہے۔ وہ خطوط۔ روزنامچوں اور تذکروں کے مختلف النوع انبار میں سے ایک مسلسل منشا تلاش کر لیتا اور اسے فن کے ایک پیکر کی صورت میں مرتب کر دیتا ہے۔ پچی کاری کا کام کرنے والوں کی مانند اس کا کمال ترتیب میں ہے۔ وہ اپنے مواد کی شکل نہیں بدل سکتا۔ اس کا کام یہ ہے کہ ایک ایسا خاکہ تیار کرے۔ جس میں واقعات کے ننھے سنگریزے جیسے ہیں۔ ویسے کے ویسے ٹھیک طرح بیٹھ جائیں۔ مزید براں اس کے تخیل کا کارنامہ اس کی اس قابلیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے مواد میں زندگی کی روح پھونکے۔ حقیقت کی بو کھی

ہوئی ہڈیوں پر زندہ گوشت اور خون یوں چڑھائے کہ پڑھنے والے کو وہ زندہ نظر آنے لگیں۔
چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ سوانح نگاری حقیقت کی ہم عناں رہنے پر مجبور ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس میں تنوع کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک ہی شخص کی دو سوانح عمریاں یوں لکھی جا سکتی ہیں کہ ایک دوسری سے نہایت مختلف ہو۔ اور پھر بھی دونوں کی دونوں نہایت خوب ہوں۔ ایک ہی کہانی میں طنز نگار تفنن، جذبات پرست تاثیر پیدا کر سکتا ہے اور محقق اسی کا ایک تاریخی مقالہ بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ غرضیکہ سوانح نگاری کے مخصوص رنگ تمام تر لکھنے والے اور اس کے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ اور نقطۂ نظر کے انتخاب کے علاوہ جدید سوانح نگار کو اس امر کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ کہ اس کے موضوع کا تناسب نہ بگڑنے پائے۔

یوں سمجھئے کہ سوانح نگار کو تلوار کی دھار پر چلنا ہوتا ہے۔ اس پر آرٹ اور زندگی دونوں کے تقاضے ہوتے ہیں۔ اس کی کتاب تصویر کی حیثیت سے بھی کامیاب ہونی چاہئے اور شبیہہ کی حیثیت سے بھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ موجودہ عہد کے سوانح نگاروں نے یہ توازن ہمیشہ قائم رکھا ہے۔ بعض نے فن پر زندگی کو قربان کر ڈالا۔ اور بعض نے زندگی پر فن کو۔ جنہوں نے زندگی پر فن کو قربان کیا۔ وہ ہمیں واقعات بہت سے دے دیتے ہیں۔ اور انہیں بہت خوشگوار طریق پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن فن کے اعتبار سے انہیں ایک وحدت میں ترتیب نہیں دیتے۔ اس کے برعکس جو مصنف زندگی کو فن پر قربان کر دیتے ہیں۔ ان کی تصاویر میں جان تو ہوتی ہے لیکن صحت نہیں ہوتی۔ وہ اہم واقعات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تاثیر پیدا کرنے کے لئے انہیں ایسا مسخ کر ڈالتے ہیں کہ ان کی صحیح اہمیت ضائع ہو جاتی ہے۔ یا وہ معلومات کی کمی کو اپنے ظن اور قیاس سے پورا کر لیتے ہیں۔ دونوں چیزوں کا توازن قائم رکھنا اتنا نازک کام ہے کہ غلطی ہو جانا بہت معمولی بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ غلطی نہ ہونا بھی ناممکن نہیں ہے۔

میرے محترم دوست کے۔اے حمید بیرسٹرایٹ لا مورخ ہیں۔ہندوستان اور یورپ میں ان کے اوقات کا بیشتر حصہ تاریخ کے مطالعے میں صرف ہوا۔تاریخ کے موضوع پر وہ کئی قابل قدر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اپنی پریکٹس کی مصروف زندگی میں سے وہ اب بھی جب کبھی وقت نکال لیتے ہیں کامیاب ہوتے ہیں۔ان کا قلم تاریخ ہی کی خدمت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ان کا یہی شوق ان سے مسلمانان عالم کے نام سے مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ سیاست اور تمدن کی تاریخ نو جلدوں میں لکھوا رہا ہے۔تاریخ سے انہیں عمر بھر ایسا غیر معمولی شغف رہا۔اور تاریخ کے مطالعہ کا ایسا صحیح ذوق ان میں پیدا ہو چکا ہے۔کہ ان کی کسی کتاب میں ان سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ زندگی کو آرٹ پر یکسر قربان کر ڈالیں گے۔

انہوں نے مشاہیر عالم اس لئے نہیں لکھی۔کہ اس میں جن مشاہیر کا ذکر ہے۔وہ ان کی زندگی کے موضوع کو کسی مخصوص فن کارانہ اظہار کے لئے موزوں سمجھتے تھے۔انہیں ایک مورخ کی حیثیت سے ان مشاہیر کی زندگیاں افادی اعتبار سے سبق آموز اور بصیرت افروز اور ولولہ انگیز معلوم ہوئیں۔لیکن ان کے بیان کے لئے انہوں نے انداز پرانا اور خشک اور مورخانہ اختیار نہیں کیا۔ان کے مطالعے کو دلچسپ اور خوشگوار بنانے کے لئے انہوں نے اسلوب نگارش ایسا سمویا ہوا رکھا۔کہ کتاب میں کہیں تاریخی ثقالت کا دخل نہیں ہونے پایا۔بلکہ تمام مضامین ایسی تصنع و تکلف سے مبرا داستانیں بن گئے۔جن میں واقعات ایک مخصوص و محتاط تناسب سے بیان ہوئے ہیں۔نہ پڑھنے والا کسی غیر اہم واقعے کی طوالت سے اکتانے پاتا ہے۔اور نہ کسی اہم واقعے کا اختصار پڑھنے والے کو تشنہ چھوڑ جاتا ہے۔سادگی اور روانی کے پروں پر واقعات ایک خوشگوار بے تکلفی سے اڑے چلے جاتے ہیں۔ان امور کا خیال کرتے ہوئے ان کی یہ تصنیف اردو میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دی جا سکتی ہے۔

والٹیر نے جب مولیئر کی مختصر سوانح حیات مرتب کی۔تو اس کے دیباچہ میں لکھا تھا"ایک طرف تو

پڑھنے والوں کو فضول باتوں کے مطالعے کا اشتیاق ہے۔ اور دوسری طرف ہمارے مصنفوں کا یہ عالم ہے۔ کہ اگرچہ مواد چند صفحوں ہی کا ہوتا ہے لیکن کتاب بہر حال ضخیم تیار کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مشاہیر کے حالات زندگی بے کار تفصیلات اور مبالغہ آمیز باتوں اور بے جان اور غلط معلومات سے ہمیشہ برباد ہو جاتے ہیں۔"

لیکن آج کل حالات اس کے برعکس ہو چکے ہیں۔ ایک طرف تو مصروف زندگی لوگوں کو طویل تحریریں پڑھنے کی مہلت نہیں دیتی۔ اور دوسری طرف مشاہیر کے متعلق مواد اس قدر کثرت سے موجود ہے کہ اس میں سے ایسی مفید باتوں کو انتخاب کرنا جو مشاہیر کے کردار۔ دماغ شخصیت اور کارناموں پر سلیقے سے روشنی ڈالیں۔ کچھ کم محنت طلب کام نہیں ہے۔ لیکن حمید صاحب نے یہ کاوش اس خوبی اور بے تکلفی سے کی ہے۔ کہ کتاب کے مطالعے سے کہیں اس کا سراغ بھی نہیں ملنے پاتا۔

اس کتاب میں سترہ مشاہیر کے حالات زندگی درج ہیں۔ موجودہ زمانہ کے سب مشاہیر ایسے ہیں۔ جن کے نام سے دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے۔ جن کی ذات سے ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل، تعلیم یافتہ ہر ایک دلچسپی رکھتا ہے اور جن کے صحیح اور مستند حالات۔ سے متعارف ہونے کا ہر دل میں اشتیاق ہے۔ زمانہ موجودہ کے مشاہیر کے علاوہ حمید صاحب نے اپنے دو ایک محبوب پرانے مشاہیر کے حالات بھی شامل کر دیئے ہیں۔ یہ انھوں نے دو خیالوں سے کیا۔ ایک تو اس خیال سے کہ عظمت کے قدیم و جدید معیاروں کا موازنہ بہ سہولت ہو سکے اور دوسرے اس خیال سے کہ کتاب کے آئندہ حصوں میں نئے مشاہیر کی تعداد بتدریج ختم کرتے ہوئے وہ چاہتے ہیں۔ کہ پرانے مشاہیر کا حصہ بڑھاتے چلے جائیں تاکہ آج کل کے مصروف کتب بین ان سے بھی متعارف اور روشناس ہوئے بغیر نہ رہیں۔

مجھے یقین واثق ہے کہ یہ کتاب اردو میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر کے اسی قسم کی دوسری

مفید اور خوشگوار کتابوں کی تصنیف میں مصنف کی حوصلہ افزائی کا باعث بن سکے گی۔

لاہور

مورخہ یکم جولائی ۱۹۳۹ء

سیّد امتیاز علی تاج

اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین پرنٹر چھپا اور محمد نصیر ہمایوں پبلشر نے قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا۔

مشاہیر عالم

دانتے

زمانے نے عجیب و غریب رنگ دیکھے۔ مگر ان سب پر فراموشی کی چادر ڈال دی۔ سکندر اعظم، صلاح الدین ایوبی، نپولین، چنگیز خاں اور امیر تیمور ایسی کئی ہستیاں دُنیا کے بحرِ ناپید کنار سے اُبھریں اور ہمیشہ کے لئے غرقاب ہو گئیں۔ وقت کے ابدی مسافر نے اِن کی یادگاروں پہ چار آنسو بہائے اور خاموشی سے گذر گیا۔ اُن کی بنائی ہوئی فلک بوس عمارتیں منہدم ہو کر مٹی میں مِل گئیں۔ سینکڑوں تاجدار ایسے بھی ہوئے کہ زمانہ اُن کے نام سے آشنا بھی نہیں ہے۔ لیکن اقلیم سخن کے شہنشاہوں کا کلام ابدالآباد تک زندہ رہیگا۔ قومیں انہیں پڑھکر سر دھنینگی۔ مُلکوں کو اُنکی ہستیوں پر ناز ہوگا۔ اُنکا کلام رُوحوں میں کیف اور دماغوں میں مستی پیدا کریگا۔ شہنشاہ اُسے سرہانے رکھ کر سونا باعثِ فخر سمجھیں گے۔ اُسکے اثرات سے دِلوں میں تڑپ پیدا ہوگی۔ خیالات کی رفعت، افکار کی نزاکت اور محاوروں کی بندش سے تلاطم خیز موجیں اُٹھینگی

اور یحربیکراں بنسکر دنیا کی کثافت کو نیست و نابود کر دینگی۔ اِن شاعروں کی صفِ اوّل میں دانتے کا نام آفتاب نصف النہار کی طرح دُنیا کے قیامت تک درخشاں رہیگا۔

یہ اقلیم سخن کا شہنشاہ پندرہ مئی ۱۲۶۵ء میں بمقام فلارنس پیدا ہوا۔ والدہ کا نام نامی "بیلا" تھا۔ والد کا سایہ کمسنی ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اسکا خاندان تمام اٹلی میں معزز اور شریف سمجھا جاتا تھا۔ اِسکے دادا کیگیندڑا نے بادشاہ کنارڈ سوم کے ہمراہ صلیبی جنگوں میں نمایاں حصّہ لیا تھا اور مورث اعلیٰ اِنے فلارنس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اُسکی والدہ نے اِس اعلیٰ طریقہ سے اس کی تربیت کی، کہ دُنیا آج تک خراج تحسین ادا کر رہی ہے۔

چوبیس سال کی عمر میں اُس نے مشہور و معروف جنگ "کیمپلیوڈینو" میں شمولیت کی اور مردانگی کے وہ وہ جوہر دکھلائے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ دورانِ جنگ میں اُس نے رسالہ کی صفِ اوّل میں بہر معمولی خصوصیت حاصل کی جسکی وجہ سے اُسکی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اُسکی کتاب "دنیا نیوا" سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جنگ مذکور سے بہت قبل وہ محبت کے تیر سے گھائل ہو چکا تھا اسکے دِل میں بیٹرس کا عشق اسوقت شروع ہوا جب وہ نام خدا آٹھ سال کی تھی اور دانتے کا سِن ابھی پورے نو سال کا نہ ہوا تھا۔

"دانتے کی پہلی ملاقات" فالکو پورٹنری کے مکان پر ہوئی۔ جو بیٹرس کا باپ تھا۔ وہ ایک تقریب کے موقعہ پر اپنی والدہ کے ہمراہ دعوت میں مدعو کیا گیا تھا۔ بیٹرس کو دیکھتے ہی اسکے دِل پر اتنا گہرا زخم لگا۔ کہ تمام عمر نہ بھر سکا۔ عین عالم شباب میں ناکتخدا بیٹرس اِس دارِ فانی سے چل بسی۔ مگر دانتے عمر بھر اُس کی نوحہ خوانی کرتا رہا۔

یہ عجیب بات ہے۔ کہ باوجود عشق و محبت اور لڑائیوں میں شمولیت کے دانتے کی علم و ادب سے دلبستگی نہ گئی۔ اُس نے پاڈیڈا اور بولانا کے دارالعلوم سے تحصیل علم کی پھر علم کی تشنگی اُسے کشاں کشاں پیرس اور آکسفورڈ کے دارالعلوم تک کھینچ لائی۔ اور پیرس سے اُس نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

بیٹرس سے اسکا عشق دن بدن بڑھ رہا تھا۔ وہ زندگی کا بیشتر حصہ اس کی نوحہ خوانی میں بسر کرتا۔ اسکے سر میں اسکا سودا تھا۔ اُسکی آنکھ اس کی جستجو میں تھی۔ وہ کہتا تھا

؎ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق   نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

۱۲۹۱ء کے آغاز میں اسکے عزیز و اقارب نے اُسے مجبور کیا۔ کہ کم از کم وہ غم غلط کرنے کی نیت سے شادی کر لے۔ اس اصرار پر اُس نے ایک معزز اور شریف گھرانے کی لڑکی "گیما" سے عقد کر لیا جسکے بطن سے اُنکے ہاں کئی بچے پیدا ہوئے۔ لیکن گیما کے مزاج کی تیزی نے اُسکی زندگی کو تلخ اور بے مزہ بنا دیا۔ وہ آئینفرنو میں رقمطراز ہے:۔

"میری بیوی کا مزاج اس قدر تیز ہے۔ کہ میں زندگی کو ایک کڑوا اچپل تصور کرتا ہوں۔ اسکی ہر بات سے وحشت ٹپکتی ہے۔ اور میری زندگی نہایت تلخ ہے"۔

۱۳۰۰ء کے وسط میں وہ فلارنس کے سب سے بڑے معزز عہدہ پر فائز کیا گیا۔ فلارنس ایک ریاست تھی جس کی حکومت ایک کمیٹی کے سپرد تھی۔ یہ کمیٹی متعدد اشخاص پر مشتمل تھی۔ اور دانتے اُسکا صدر تھا۔ مگر یہی عہدہ اُسکے مصائب کا سبب بنا۔ ان دنوں میں یوں تو کئی پولیٹیکل پارٹیاں تھیں۔ مگر اُن میں قابلِ ذکر صرف دو تھیں۔ ابتدا میں تو اختلاف محض تقریروں تک محدود

رہا۔ مگر آخر میں ہاتھا پائی اور گتھم گتھا تک نوبت پہنچ گئی۔ ایک فریق کے ممبر شہر کے ایک گرجا میں جمع ہوئے اور غور و پرداخت کے بعد طے پایا۔ کہ مقدس پوپ کی وساطت سے "چارلس آف والوا" کو بلا کر شہر میں امن و امان قائم کرایا جائے۔ جونہی اس قرارداد کا پتہ فریق مخالفت کو چلا۔ اس نے جلسہ عام میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اور برملا کہا۔ کہ فریق اوّل نے اس معاملہ میں جسکا تعلق محض ریاست اور شہر سے تھا۔ حضور پوپ کی مداخلت طلب کرنے میں گستاخی کی ہے۔ دراصل فریق اوّل کا ارادہ فریق دوم کے خلاف بغاوت پھیلا کر اُسے شہر بدر کرانے کا تھا۔ فریق دوم نے ہتھیار اٹھانے اور حکومت کی کمیٹی سے فریق اوّل کی جلاوطنی کا مطالبہ کیا۔ دیگر رفقا کے صلاح و مشورہ کے بعد دانتے نے دونوں فریقوں کے سرغنوں کی جلاوطنی کا حکم صادر کردیا۔ مگر بعد کو غالب فریق سے مرعوب ہو کر دانتے نے اُن کی پارٹی کی جلاوطنی کا حکم یک قلم منسوخ کردیا۔ پھر کیا تھا۔ لوگوں نے دانتے کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ اور پوپ سے فریاد کی۔ جس نے "چارلس آف والوا" کو مامور کیا۔ کہ وہ فلارنس پہنچکر تمام امور کو اپنے ہاتھ میں لے اور کمزوروں کی فریاد رسی کرے۔ جب چارلس فلارنس پہنچا۔ تو دانتے ملکی امور کے سلسلہ میں رُوم گیا تھا۔ چارلس نے سرحدی تحقیقات کے بعد دانتے کے تمام احکام منسوخ کردئیے۔ اس پر طرفداری کا الزام عاید کیا گیا۔ اسکی تمام جائیداد ضبط کی گئی۔ اور اسکی جلاوطنی کا حکم صادر کیا گیا۔ دانتے کو جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ فلارنس واپس آئے۔ اسلئے وہ سیدھا "سینا" پہنچا۔ جہاں تفصیل کے ساتھ اُسے جلاوطنی کی شرائط کا پتہ چلا یہاں اُس نے بہت اقتدار و رسوخ حاصل کرلیا۔ اور حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ وہ فلارنس پر حملہ کرے۔ ۱۳۰۵ء میں ایک جرار لشکر کے ساتھ اُس نے فلارنس پر فوج کشی کی۔ مگر ہزیمت اٹھائی

پڑی۔اس ناکامی کا اس کی طبیعت پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ وہ سینا چھوڑ کو بہت دیر تک بے خانماں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔اس دوران میں اُسے کئی ملکوں کا سفر درپیش آیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اُسکی ملاقات ایک عرب سے ہوئی جس نے پیغمبرِ اسلام کی معراج کے حالات اُسکے گوش گذار کئے جلیلی طبیعت اِن حالات کو سنکر پھڑک اُٹھی۔ اور وہ ایک زمانہ تک اُس پر سوچ بچار کرتا رہا۔ آخرکار معراج کا قصہ اسکی مشہور و معروف کتاب "ڈیوائن کمیڈی" لکھنے کا محرک ہوا جسکی وجہ سے اُسے حیاتِ ابدی نصیب ہوئی۔ ۱۳۰۸ء تک وہ بغیر کسی مقصد کے یورپ نوردی کرتا رہا۔ اس زمانے کی سرگذشت اسکی اپنی زبان سے سُننا خالی از لُطف نہ ہوگا۔ وہ لکھتا ہے:۔

" کاش مجھے قادرِ مطلق نے پیدا نہ کیا ہوتا۔ میری جلاوطنی کی داستان اہلِ بصیرت کے لئے درسِ عبرت ہے۔ فلارنس والوں نے مجھے جلاوطن کر کے ستم ڈھایا ہے۔ میری غربت انتہائی مدارج تک پہنچ چکی ہے۔ میں اُس کشتی کی مانند ہوں جسکے بادبان نہ ہوں۔ اور جسے ہوا کے تھپیڑے اِدھر اُدھر لئے پھرتے ہوں۔ میں اس شرابی کی مانند ہوں جو اپنے دردِ سر کا علاج شراب پینے سے کرتا ہے۔

میں اِس بات کا قائل ہوں

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

فلارنس واپس جانے کی تڑپ اُسے ہر وقت بیقرار رکھتی۔ اُس نے کئی عرضیاں حکومت کے اربابِ بست و کشاد کی خدمت میں بھیجیں۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ آخر اُس کی تمنائیں بر آئیں۔ اور اُسے اِس شرط پر وطن واپس آنے کی اجازت دی گئی۔ کہ وہ حکومت کے خزانہ میں ایک بہت بھاری رقم بطور جرمانہ داخل کرے اور اپنے جرم کا اقرار جلسۂ عام میں کرے مُلک و ملت سے

بغیر شروط معافی کا طلبگار ہو۔ مگر سقراط کی طرح اُس نے ان بے عزتی کی شرائط کو قبول کرنے سے جلاوطنی کی زندگی کو ترجیح دی۔

رومانیہ کی حکومت نے جہاں وہ مقیم تھا۔ اس کو ایک خاص مشن و نائب سفیر وینس بھیجا۔ مگر وہ بادشاہ وقت کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اس مایوسی اور ناکامی کا اُسکی طبیعت پر اسقدر اثر ہوا۔ کہ ماہ ستمبر سنہ ۱۳۲۱ء کو چھپن سال کی عمر میں اس دُنیا سے کوچ کر گیا۔ گائیڈو بادشاہ رومانیہ نے اُسکی قبر پر ایک نہایت شاندار مقبرہ تعمیر کرانا شروع کیا۔ مگر وہ اس کی تکمیل نہ کر سکا۔ سنہ ۱۳۹۶ء میں کارڈینل نے اس مقبرہ کی تکمیل کرا دی اور ایک عالیشان مینار اس کی یاد میں قائم کیا۔ پچاس سال کے بعد اہل فلارنس کو اسکی قدر و منزلت کا پتہ چلا اور انہوں نے رومانیہ سے درخواست کی۔ کہ وہ دانتے کی لاش کو فلارنس لانے کی اجازت دے۔ مگر اُس نے اس درخواست کو مسترد کر دیا۔

سنہ ۱۸۶۵ء میں کارڈینل کازنگو نے ایک نہایت عمدہ میموریل اُسکی یاد میں قائم کیا۔

دانتے کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ دو بڑے لڑکوں کو ذہانت باپ سے ترکہ میں ملی تھی۔ انہوں نے باپ کی کتاب ڈیوائن کامیڈی کا تصویری مرقع بنایا۔ جو بہت ہی مقبول ہوا۔ اور آج یورپ کے بہترین مرقعوں میں شمار ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹا لڑکا ایک کامیاب بیرسٹر تھا۔ جو ویرونا میں پریکٹس کرتا تھا۔ دانتے نے اپنی لڑکی کا نام اپنی معشوقہ کے نام پر بیٹریس رکھا تھا اور اُسے اُس سے گہری دلچسپی تھی۔ بیٹریس باپ کی وفات کے بعد سٹفینو کی کانونٹ میں بطور نن شامل ہو گئی اور اپنی تمام عمر باپ کی قبر کے پاس گذار دی۔ سنہ ۱۳۵۰ء میں فلارنس کی حکومت نے

بیٹریس کو اُسکے باپ کی کتاب "ڈیوائن کامیڈی" کے صلے میں دس پونڈ اور خلعت پیش کئے جسے اُس نے بخوشی قبول کیا۔ اُس زمانے میں دس پونڈ اور خلعت انتہائی اعزاز کا باعث سمجھا جاتا تھا۔

بعید از انصاف ہوگا۔ اگر ہم دانتے کی بیوی کے متعلق چند سطور سپرد قلم نہ کریں۔ اسمیں کلام نہیں کہ وہ تیز طبیعت کی عورت تھی۔ مگر ذہانت، قابلیت اور شجاعت خاص طور پر قدرت نے اُسے ودیعت کی تھی۔ دانتے کی جلاوطنی کے بعد اُس نے نہایت فراست سے کام لیا اُس نے حکومت سے درخواست کی کہ ضبط شدہ جائیداد کا ایک حصہ دانتے اُسے بطور جہیز دے چکا ہے۔ اس لئے وہ قابل ضبطی نہیں۔ اس عورت نے حکومت کی کمیٹی کے روبرو ایسی مدلل تقریر کی کہ حکومت اس حصہ کو واگذار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس جائیداد کی قلیل آمدنی سے اُس نے اس معقولیت سے بچوں کی تربیت کی کہ زمانہ اسکی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

دانتے ایک نہایت معقول اور سنجیدہ انسان تھا۔ اُسکا قد میانہ تھا۔ وہ آہو چشم تھا اسکے کالے گنگریالے بال نہایت خوشنما تھے۔ بہت زیادہ مطالعہ سے اس کی بینائی میں فرق آگیا تھا۔ وہ کھانے میں نہایت اعتدال سے کام لیتا۔ اسکے اخلاق حمیدہ ضرب المثل تھے اور فنِ مصوری میں اسے ملکہ خداداد حاصل تھا۔

اُس نے دو کتابیں "دی منارکیا" اور "ولگری اولیک" لاطینی زبان میں لکھی ہیں۔ اول الذکر میں اُس نے پوپ کے اختیارات پر بحث کی ہے۔ اسکا خیال ہے۔ کہ پوپ کو دنیوی اختیارات دینا غلطی ہے۔ وہ اسے صرف مذہبی راہنما خیال کرتا ہے۔ اور اسکا دنیوی امور میں مداخلت کرنا گناہ عظیم سمجھتا ہے۔ موخر الذکر میں اُس نے فنِ مصوری اور اٹلی کے سفر پر بحث و تمحیص کی ہے۔

"دنیا نیوالا" اُس نے اسوقت لکھی تھی۔ جب اُسکا سن اٹھائیس سال کا تھا۔ اسمیں وہ بیٹرس کے حسن و عشق کا قصہ نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ بیٹرس کی وفات کا قصہ خاص طور پر رقت انگیز ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

میں عام لوگوں سے بیٹرس کے عشق کا افسانہ چھپاتا۔ مگر عشق کب تک پردہ راز میں رہ سکتا تھا مجھے اسکے متعلق غلط فہمی تھی۔ کیونکہ ؎

زمانہ بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی   سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے راز داں تک ہے

میں تجاہل عارفانہ سے کام لیتا اور ایک اور خاتون سے اپنے عشق کو منسوب کرتا تھا۔ جس وقت بیٹرس کی وفات کا پتہ چلا۔ میں اُسوقت اُسکی شان میں قصیدہ مدحیہ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں یہ وحشت ناک خبر سُنکر بیہوش ہو گیا۔ میں کوچوں سڑکوں اور جنگلوں میں موت کی تلاش میں پھرا مگر موت مجھ سے کوسوں بھاگتی رہی"۔

اِس کی کتاب ضیافت ایک اعلےٰ پایہ کی کتاب تصور ہوتی ہے۔ اس میں اُس نے عشق اور نیکی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اسکے چودہ باب ہیں اور لاطینی زبان میں لکھی گئی ہے وہ اسکے متعلق رقمطراز ہے :۔

مجھے اس بات کا احساس ہے۔ کہ میرے ہم وطن بھائی مجھ پر آوازے کسیں گے۔ کہ میں نے یہ کتاب لاطینی میں کیوں لکھی ہے۔ حالانکہ مجھے یہ اطالوی میں لکھنی چاہیئے تھی۔ میں اس امر کو چھپانا نہیں چاہتا۔ کہ اطالوی ابھی بچپن کے عالم میں ہے۔ اور میری نازک خیالیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی دیگر اقوام مثلاً جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور روسی بھی میرے

خیالات سے بہرہ اندوز ہوں۔ لاطینی یورپ کی علمی زبان ہے اور اسکے مقابلے میں اطالوی سمجھنے والے بہت کم ہیں"

اسی کتاب میں وہ فلسفہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

بیٹرس کے بعد میری دُوسری معشوقہ زمانہ کی دختر نیک اختر ہے۔ جسے فلپثا غورث کے متبع فلسفہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ میری آنکھوں کی رُوح ہے۔ اس کے ذکر سے میرا دِل ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اور مجھے ایک گونہ مسرت ہوتی ہے"۔

اسکی رزمیہ نظمیں بہت دقیق ہیں۔ اور ان کو بغیر شرح کے سمجھنا آسان کام نہیں۔ ہر شعر سے نازک خیالی اور اخلاقی سبق مترشح ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ بیٹرس محض ایک خیالی کیر یکٹر ہے۔ مگر آج تحقیق اور جستجو سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ وہ فلارنس کی رہنے والی فالکو پورٹنری کی لڑکی تھی۔ جو چوبیس سال کی عمر میں راہئ ملکِ بقا ہوئی۔

دانتے کی معرکتہ الآرا کتاب "ڈیوائن ویپن" ہے۔ جس پر جدید یورپ کو خاص طور پر ناز ہے۔ یورپ بارہا اِس امر کا اعادہ کر چکا ہے۔ کہ اس نوعیت کی کتاب صرف ایک مغربی ہی سپرد قلم کر سکتا تھا"۔ ہم اس بات کے قائل ہیں۔ کہ چاند پر تھوکنے سے اُسکا کچھ نہیں بگڑتا۔ مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ ڈیوائن ویپن کا خیال یقیناً معراج سے اخذ کیا گیا ہے۔ اسمیں کلام نہیں کہ دانتے نے تفصیل کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اور اپنی بلند پروازی اور خیال کی رفعت سے اسے ایک اعجوبہ بنا دیا ہے ہمیں دانتے سے خاص عقیدت ہے۔ ہم اسے شعر کا شہنشاہ خیال کرتے ہیں۔ اور اس کتاب کو زمانہ کا شاہکار سمجھتے ہیں۔ لیکن یورپ کے اس شاعرانہ کارنامے

کی تذلیل کرنے سے ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے۔ کہ یہ خیال کہ صرف ایک مغنی ہی ایسی کتاب لکھ سکتا ہے۔ اتنی سی بات تھی۔ جسے افسانہ کر دیا کا مصداق ہے۔

ڈیوائن ویین میں عالم بالا کے حالات درج ہیں۔ جزا و سزا پر بحث ہے۔ رُوحوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اور مختلف ممالک کے حالات اِس دلچسپی سے درج ہیں۔ کہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں

۱۳۵۰ء میں گیوانی وسکونٹی ارچ بشپ میلان نے اٹلی کے چھ عالموں کی ایک کمیٹی اس غرض و غایت سے بنائی کہ وہ کتاب مذکور کی شرح لکھے۔ اِس شرح کا مسودہ نہایت احتیاط کے ساتھ فلارنس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۱۳۷۳ء میں اٹلی کے محکمۂ دینیات میں ایک عہدہ قائم کیا گیا۔ جس کی تنخواہ سو پونڈ ماہوار تھی۔ اور جس کا کام صرف یہ تھا۔ کہ وہ ڈیوائن ویین کے متعلق عوام کو درس دے۔ آج کتاب مذکور کی متعدد شرحیں مختلف زبانوں میں ملتی ہیں۔ ایشیا۔ یورپ افریقہ۔ امریکہ اور آسٹریلیا کی مختلف زبانوں میں اصل کتاب ترجمہ ہو چکی ہے۔ اور دُنیا کی چند معرکتہ الآرا کتابوں میں اسکا شمار ہوتا ہے۔

کتاب کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ کہ دانتے ایک رات لق و دق صحرا کی بادیہ پیمائی کر رہا ہے سامنے ایک پہاڑ نظر آتا ہے۔ جس پر وہ چڑھنا چاہتا ہے۔ مگر خونخوار درندے اس کے عزم میں مانع ہوتے ہیں اسی تگ و دو میں اسکی ملاقات ورجل سے ہوئی۔ جس نے اسے دوزخ کے نظارے اور اعراف دکھانے کا وعدہ کیا۔ بشرطیکہ وہ اُسے اپنا رہنما مان لے۔ دانتے کو سخت تشویش تھی۔ کہ وہ سفر کی تکالیف برداشت کر سکے گا۔ یا نہیں۔ مگر جب

ورجل نے اس کی دلجوئی کی۔ تو وہ اُنکے پیچھے ہولیا۔ ورجل اور دانتے دوزخ کے دروازے پر پہنچے۔ باوجود اس خوفناک تنبیہ کے جو دروازہ پر کندہ تھی۔ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ ورجل نے اُسے بتلایا کہ یہاں اُن لوگوں کو سزائیں مل رہی ہیں جنہوں نے زندگی سُستی اور کاہلی سے گذار دی ہے۔ وہاں سے وہ دریا کے کنارے پر پہنچے۔ جہاں بڈھا ملاح کراں رُوحوں کو ایک کشتی میں دریا کے دُوسری طرف پہنچا رہا تھا۔ روحوں کا عذاب دیکھ کر دانتے بیہوش ہوگیا بجلی کی کڑاک سے دانتے کو ہوش آیا۔ تو وہ اپنے راہنما کے ساتھ "لیمبو" میں جو دوزخ کا پہلا طبقہ ہے پہنچے۔ یہاں وہ لوگ سزائیں بھگت رہے تھے۔ جو خداوند مسیح پر ایمان نہ لائے تھے پھر وہ دُوسرے طبقہ میں پہنچے جہاں انہوں نے فلارنس کے ظالم جج مانوس کو دیکھا۔ تند ہوا کے تھپیڑے دوزخیوں کو ادھر سے ادھر پھینک رہے تھے۔ یہ دردناک عذاب دیکھکر دانتے پر غشی طاری ہوگئی۔ جب دانتے کو ہوش آیا۔ تو انہوں نے اپنے آپ کو طبقہ سوم میں پایا جہاں لالچی اور طامع لوگ جمع تھے۔ اُن پر برف شدت سے پڑ رہی تھی۔ اُنکے اُوپر گندہ اور غلیظ پانی بہہ رہا تھا۔ ایک دوزخی کا بکو نامی نے انہیں بتلایا۔ کہ فلارنس والوں کو اُن کی نااتفاقی کیوجہ سے عنقریب سخت سزا ملنے والی ہے۔ دانتے نے ورجل سے ایک معمہ کا حل دریافت کیا جس کو رہنما نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ چوتھے طبقہ میں انہوں نے پلوٹس کو دیکھا جہاں فضول خرچ اور حریص اپنے کیفر کردار کے نتائج بھگت رہے تھے۔ پانچویں طبقہ میں مغلوب الغضب لوگوں کو تسکین جھیل میں غوطے دیئے جا رہے تھے۔ جھیل کے قریب ایک مینار تھا۔ دونوں وہاں پہنچے۔ مینار سے ایک جھنڈی لہرائی گئی۔ اور ملاح فلگیاس اُنہیں جہاز کے ذریعہ سے جھیل کی

دوسری طرف لیگیا۔ فلپ ارجنٹی نہایت تکلیف دہ عذاب میں مبتلا تھا۔ پھر وہ شہر ڈلیس میں پہنچے۔ جس کے دروازے بند تھے۔ اور دیو پہرہ دے رہے تھے۔ اُن کو شہر میں داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ نہایت دقت کے بعد وہ شہر میں داخل ہوئے۔ وہاں آگ کے فلک بوس شعلے دردناک منظر پیدا کر رہے تھے۔ اسی طرح انہوں نے دوزخ اور اعراف کے تمام طبقوں کی سیر کی۔

پھر بیٹرس اُنہیں بہشت میں لے گئی۔ اور وہاں کے عجیب منظر دکھائے۔ دانتے کی اس معرکتہ الآرا کتاب نے تمام دنیا میں ادبی دلچسپی کا ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ اور اسی کی بنا پر اسے اقلیم سخن کا شہنشاہ مانا گیا ہے۔ اندھیری رات میں جب علم کے مسافر بھٹک کر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تو اُس کا کلام چودھویں رات کے چاند کا کام دیتا ہے۔ آج وہ دُنیا میں زندہ نہیں۔ مگر اُس کا یہ شاعرانہ کارنامہ ابدالآباد تک زندہ رہیگا ؂

آئن سٹائن

سائنس کی دنیا میں مشکل سے دو یا تین نام ایسے ہوں گے جو مشہور و معروف سائنس داں البرٹ آئن سٹائن کے نام کے ساتھ لیئے جاسکیں۔ ممکن ہے کہ ان سے بڑھ کر ریاضی داں اور فلسفی بھی پیدا ہوئے ہوں۔ مگر یہ یقینی بات ہے۔ کہ آج تک ایسا بلند خیال انسان دنیا نے نہیں دیکھا۔ آج دنیا میں ان کے نظریئے کا عالمگیر چرچا ہے۔ اور دنیا ان کی قابلیت کا لوہا مان کر خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیئے بیقرار ہے۔

شروع شروع میں حکماء و علما ان کے اصول کو قطعی طور پر نہ سمجھ سکے۔ اس لیئے انہوں نے بہت مخالفت کی ۱۹۲۲ء تک ان کے خلاف اس قدر ہیجان تھا کہ سائنس دانوں اور حکماء نے ان کے اصول کے خلاف شدید صدائے احتجاج بلند کی اور لکھا "ہم جرمنی کی اعلیٰ علمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنے کے لئے بیقرار ہیں کہ حکیم موصوف کا اصول جو دنیا میں مشہور ہو رہا ہے۔ محض فضول بے بنیاد اور لغو ہے۔" بتدریج یہ مخالفت کم ہوتی گئی۔ اور آج اس اصول کی جو قدر و منزلت کیجاتی ہے۔ وہ کسی تذکرے کی محتاج نہیں۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ آمیز نہیں کہ حکیم موصوف نے سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر کے علم کی وہ خدمت کی ہے جس کو آنیوالی نسلیں فخر سے یاد کرینگی۔ آج ان کا علم مشرق و مغرب کو منور کر رہا ہے۔

لکھنے والوں نے ان کے بچپن کے حالات یوں لکھے ہیں کہ "وہ اس قدر نحیف البدن

اور کمزور تھے۔ کہ بسا اوقات ان کے والدین کو یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ان کا دماغی توازن قائم نہیں ہے۔ تین سال تک انہوں نے بات چیت کرنی نہ سیکھی اور چار سال کی عمر میں جب انہوں نے قطب نما کو دیکھا۔ تو ان کے جسم پر ایک قسم کا لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ فطرتاً نہایت نازک تھے۔ جب ان کا سن چھ سال کا ہوا تو میونچ کے ایک پرائمری سکول میں تحصیل علم کے لئے داخل کر دیئے گئے۔ یہاں داخل ہو کر انہیں احساس ہوا۔ کہ غریب اور امیر دُنیا میں یکساں نہیں ہیں، اور ان میں مساوات کا ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔ وہ بچوں کی صحبت سے گھبراتے اور تنہا رہتے میں انہیں ایک خاص مسرت حاصل ہوتی۔"

ایک دفعہ ان کے چچیرے بھائی جینوا سے میونچ آئے انہوں نے اٹلی کے حالات بیان کئے۔ وہاں کی سرسبز زمین اور قدرتی مناظر کے حالات سُنکر وہ پھڑک اُٹھے۔ کہنے لگے بیشک ایسی عجیب و غریب چیزوں کا بنانے والا بہت ہی خوبصورت ہوگا۔" ان کا دل مذہبی تعلیم کے لئے بیقرار ہوا۔ ان کے پہلو میں درد اٹھا اور صانع کے متعلق غور و خوض کرنے کی فکر پیدا ہوئی اگرچہ یہ مبارک احساس تھا۔ مگر چونکہ ان کے والدین کو مذہب سے لگاؤ نہ تھا۔ اس لئے گھر پر کسی نے اُن کے خیالات کی تائید نہ کی۔ ان کے والد متوسط الحال انسان تھے جنہیں مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ مادہ پرست تھے۔ اور سمجھتے تھے۔ کہ یہودی اصول سے نجات پا کر انہوں نے ایک عظیم الشان فتح حاصل کی ہے۔ باوجود اسکے آئن سٹائن چھوٹے چھوٹے قصائد قادر مطلق کی تعریف میں تصنیف کرتے۔ انہیں گھر اور گلیوں میں گا کر اپنے قلب حزین کی تسکین کر لیتے۔ بارہ سال کی عمر میں انہیں ستار پر اتنا قابو تھا کہ سننے والے مست ہو جاتے

تھے۔ غالباً تیرہ چودہ سال کی عمر میں اُن کی طبیعت آرٹ کی طرف مائل ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگے۔ کہ آرٹ بھی قدرت کی طرح خوبصورت ہے۔ انہیں آرٹ کا شوق ایک لیکچر سننے سے پیدا ہوا تھا۔ جو ان کے استاد نے "گیٹے" پر دیا تھا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد جب کہ وہ اپنا اصول "ریلے ٹو یٹی" (RELATIVITY) شائع کر چکے تھے انہیں اس استاد سے ملنے کا شوق پیدا ہوا . . . . جس نے ان کے دل میں آرٹ کا شوق پیدا کیا تھا۔ وہ استاد مذکور کے پاس پہنچے۔ مگر استاد نے انہیں پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ کیونکہ اُن کو خیال ہوا کہ وہ قرض مانگنے آیا ہے۔

باوجود اس کے کہ آئن سٹائن کو فطرت اور آرٹ سے ازحد دلبستگی ہے۔ ان کی اصل شہرت ریاضی کی وجہ سے ہے جس میں انہیں بے حد دخل ہے۔ ابھی وہ بچے ہی تھے۔ کہ بغیر کسی کی مدد کے فیثا غورث مسئلے کو حل کر دیا۔ جیومیٹری میں انہیں وہ حظ آتا کہ وہ مسرت سے اچھل پڑتے۔ انکا سن صرف چودہ سال کا تھا۔ جب ان کے استاد اس بات کے قائل ہو گئے۔ کہ واقعی قدرت نے انہیں ریاضی میں خاص ملکہ ودیعت کیا ہے۔

جب وہ پندرہ سال کے ہوئے تو اُن کے والد انہیں اپنے ساتھ اٹلی کی سیر کے لئے لے گئے۔ اس وجہ سے وہ متواتر کئی ماہ سکول نہ جا سکے۔ وہ اٹلی پہنچ کر دنگ رہ گئے مناظر کو دیکھ کر ان کے دل میں ایک جذبہ اٹھا اور بے ساختہ بول اٹھے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمین است و ہمیں است

وہاں وہ لکھنے پڑھنے میں بہت زیادہ وقت صرف کرتے کتب خانوں میں جاتے اور گھنٹوں مطالعہ میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ باقی وقت پیدل سیر و سیاحت کرتے انہوں نے برملا کہہ دیا۔ کہ وہ جرمن نہیں ہیں۔ اس سے ان کا منشاء یہ تھا۔ کہ وہ ہر قسم کی قید سے آزاد ہوں اور کسی زنجیر میں جکڑے ہوئے نہ رہیں،

وہاں سے اُن کے والد نے انہیں سوئٹزرلینڈ بھیج دیا۔ وہ یہاں پہنچکر بہت مسرور ہوئے اور ایک سال کی تعلیم کے بعد زیورچ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔

وہ سائنس کے مختلف شعبوں میں از حد دلچسپی لیتے اور اس قدر مطالعہ کرتے کہ اُنکے ہمعصر حیران رہ جاتے۔ کچھ عرصہ بعد انکی طبیعت نے یک بیک فلسفہ کیطرف رجوع کیا اُنہیں حکیم ہیوم کی کتابوں میں وہ لطف آتا کہ دن رات حکیم موصوف کی تعریف میں رطب اللسان رہنے لگے۔ انہیں گھر سے جو خرچ بھیجا جاتا تھا۔ وہ اس قدر قلیل ہوتا تھا۔ کہ اس میں وہ بمشکل گذارا کرتے تھے۔ اکثر انہیں بھوکا رہنا پڑتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ معدہ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔

ان کے والد کا خیال تھا۔ کہ آئن سٹائن کسی انجنیرنگ فرم میں ملازمت حاصل کریں مگر یہ ان کے منشاء اور طبیعت کے بالکل خلاف تھا جب ان کے والد نے انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ دارالعلوم چھوڑنے کے بعد انہوں نے والد کی مرضی کے خلاف دارالعلوم میں ملازمت اختیار کر لی۔ مگر ۱۹۰۲ء میں جب کہ ان کا سن ۲۳ سال کا تھا تو وہ پیٹینٹ آفس برلن میں ایک معمولی سی اسامی حاصل کرنے

میں کامیاب ہو گئے۔

ان کا خیال ہے۔ کہ اصلی قابلیت رکھنے والے ان نوجوانوں کو جو اعلےٰ پایہ کے سائنس دان بننا چاہیں۔ اپنا پیٹ۔ موچی کا کام کرکے پالنا چاہیئے۔ یہ دار العلوم محض بیکار ہیں۔ جو اصل اور ٹھوس تعلیم نہیں دیتے۔ اس سے ہزار درجے بہتر ہے۔ کہ انسان کوئی عملی کام کرکے اپنا پیٹ پالے اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھے۔ روزی کما کر تعلیم حاصل کرنے سے اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ پیٹینٹ آفس برلن میں نہایت خوش تھے۔ اور یہیں پر اُنہوں نے اپنے اصول (RALATIVITY) کے پہلے حصّہ پر تفحص و جستجو شروع کی اصول اس قدر دقیق اور مشکل ہے۔ کہ اس کے سمجھنے کے لئے اعلےٰ ریاضی کا جاننا ازبس لازمی اور ضروری ہے۔

روشنی کی رفتار کا اندازہ لگایا جائے۔ تو رفتار متحرک یا ساکن کی ایک ہی نکلتی ہے۔ ایک شخص جو گاڑی میں بیٹھا سفر کر رہا ہو اور اس کی رفتار فی گھنٹہ ستر میل ہو۔ وہ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار کے حساب سے اس گاڑی سے دور ہو رہا ہے۔ بہر حال اس اصول کا سمجھنا نہایت دقیق اور مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کسی شئے کا حجم اور طاقت آپس میں بدلے جا سکتے ہیں۔ اور حجم اور طاقت کسی چیز کی تیزی پر انحصار رکھتے ہیں۔

۱۹۰۵ء میں جب یہ اصول پہلی بار شائع ہوا تو پائنکار اور پلینک جیسے آدمی پکار اُٹھے کہ ایسا صاحب ادراک آدمی دُنیا نے اس سے قبل نہیں پیدا کیا۔ وہ خود رقمطراز ہیں۔ کہ اسوقت میرے دماغ میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو رہا تھا۔

۱۹۰۳ء میں انہوں نے سربیا کی ایک طالبہ سے شادی کر لی۔ ۱۹۰۴ء میں اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں خرچ سے تنگ آ کر پیٹنٹ آفس کی ملازمت ترک کر دی۔ اور زیورچ کے دارالعلوم میں ادنیٰ پروفیسر کی آسامی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہیں احساس ہوا کہ اِن کے لیکچر طالب علموں پر وہ خوش گوار اثر پیدا نہیں کر رہے - جس کی انہیں توقع تھی۔ اس لئے وہ اکثر مغموم رہتے۔ کہ انہوں نے پیٹنٹ آفس کی ملازمت کیوں ترک کی -

اگرچہ رفتہ رفتہ ان کی شہرت کا آفتاب چمک رہا تھا۔ مگر وہ اس سے زیادہ خوش نہ تھے۔ یورپ کے متعدد ملکوں نے انہیں لیکچر دینے کی دعوت دی۔ اور اکثر نے نہایت معقول اور معزز آسامیاں پیش کیں۔ انہوں نے پراگ کے دارالعلوم میں پروفیسری کی ایک آسامی قبول کر لی۔ مگر اٹھارہ ماہ کے بعد انکی طبیعت اکتا گئی اور انہوں نے زیورچ مراجعت کی جہاں باقاعدہ طور پر پروفیسر متعین کئے گئے۔

ان کا شہرہ سنکر دور دراز ملکوں کے طالبعلم درس وتدریس کے لئے اِن کے پاس آئے۔ اب اِن کے مشاغل بہت بڑھ گئے تھے۔ جب برلن کے دارالعلوم کے افسروں کو اُن کی شہرت اور حالت کا علم ہوا تو انہوں نے انہیں پروفیسر کی آسامی پیش کی مگر ان کا کام درس وتدریس نہ تھا۔ بلکہ صرف اصول "ریلیٹیویٹی" پر مزید جستجو کرنا تھا۔ چلتی گاڑی میں جو سیدھی ایک رفتار پر جا رہی ہو۔ پتھر پھینکنے سے گھڑی کی رفتار وہی نتائج پیدا کرے گی جو ساکن گاڑی سے پیدا ہوں گے۔ ان کے تمام اصول محض مشاہدہ پر مبنی ہیں۔

آئن سٹائن

۲۹ مئی ۱۹۱۹ء میں انہوں نے سورج گرہن کے متعلق نہایت پر مغز مقالہ تیار کیا اور واضح کر دیا۔ کہ سورج کے کس قدر حصّہ کو گرہن لگا تھا۔ اس پر انگریزی سائنس دانوں نے ایک مہم سورج گرہن کی دریافت کے متعلق شمالی برازیل اور مغربی افریقہ روانہ کی۔ اس مہم سے آئن سٹائن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ مہذب دنیا کے تمام اخباروں نے آئن سٹائن پر مقالے لکھے۔ ان کی نسبت پمفلٹ۔ رسالے اور ٹریکٹ جاری کئے گئے، مگر اس کے باوجود عوام الناس انکے اصول کو سمجھ نہ سکے۔ انکی اصطلاحیں اور بندشیں اس قدر دقیق اور ٹھوس ہیں۔ کہ انکا سمجھنا آسان نہیں۔ وہ لوگ جو ان کے اصول کو کما حقہٗ سمجھتے ہیں لکھتے ہیں کہ ان اصولوں سے واضح ہے۔ کہ قدرت کے کام نہایت ہی عمدہ اور خوبصورت ہیں۔

جنگ عظیم کے اختتام پر دُنیا میں ان کی قابلیت مسلّم طور پر تسلیم کر لی گئی۔ ان کے اعزاز میں مختلف ممالک میں اس قدر دعوتیں۔ پارٹیاں اور تقریریں ہوئیں کہ ان کے تذکرے کے لئے بھی ایک دفتر درکار ہے۔ ان کی عکسی تصویریں عام طور پر فروخت ہونے لگیں اور دور دراز ملکوں کے نمائندے ان سے ملنے کے لئے آنے لگے۔ انکا خیال ہے کہ علم کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ وہ محض ان ملکوں میں محدود رکھا جائے۔ جہاں صلح و آشتی کا دور دورہ ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جو جنگ عظیم کے بعد مخالفین کے دارالخلافہ میں بغرض سیاحت پہنچے اور وہاں ان کا نہایت شاندار استقبال ہوا۔ جسکے وہ خود بھی معترف ہیں۔

آئن سٹائن

۱۹۱۹ء میں برلن کے یہودیوں نے ایک ریسٹورن میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں آئنسٹائن سے شمولیت کی درخواست کی۔ اگرچہ وہ یہودیت اور یہودی النسل ہونے سے متنفر تھے۔ مگر جب ان پر واضح کیا گیا کہ یہ بھی تو مخلوق کے ایک حصّہ کی خدمت ہے۔ تو وہ رضا مند ہو گئے۔ اور کہا ہاں۔ اس نظریہ سے اگر میں کسی خدمت کے قابل ہوں تو میں بسر و چشم تیار ہوں!

انہیں سیر و سیاحت کا بیحد شوق ہے۔ وہ تمام یورپ کے سفر کے علاوہ جنوبی امریکہ اور جاپان کی سیاحت بھی کر چکے ہیں۔ وہ سفر کو تعلیم کا بہت بڑا جزو بتلاتے ہیں اور سفر میں ہر روز اپنی ڈائری لکھتے ہیں۔ انہیں مشرق اور مشرقیوں سے بیحد دلچسپی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "مشرقیوں کو دیکھ کر مجھے بیحد مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ تصنع۔ مکر اور فریب سے بالکل پاک ہیں"۔

آئن سٹائن کے اخلاق قابل توصیف ہیں۔ وہ نہایت ملنسار صلح جو اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ عجز و انکسار ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ہزارہا لوگ انہیں اپنا راہنما خیال کرتے ہیں۔ اور ہر ذاتی معاملہ میں اُن سے صلاح و مشورہ لینا ازبس ضروری سمجھتے ہیں۔ ہزارہا انہیں اپنا پیر و مرشد گردانتے ہیں۔ صبر ان کے اخلاق کا جزو لاینفک ہے

انہیں درس و تدریس میں بہت بڑا دخل ہے۔ اقتصادیات۔ علم ادب۔ علم موسیقی اور فلسفہ ان کے گھر کی ادنیٰ لونڈی ہیں۔ انکا خیال ہے۔ کہ عورتوں کو تصنع سے پاک ہونا چاہیئے۔ وہ شیکسپیئر کے بہت مداح ہیں اور یورپ کی کئی زبانوں پر قادر ہیں۔

آئن سٹائن

حکیم نٹشے اور السن کو وہ دُنیا کا بہترین فلسفی خیال کرتے ہیں۔ علم موسیقی کے بہت مداح ہیں۔ اِن کا خیال ہے کہ موسیقی روح کی بہترین غذا ہے۔ جس طرح جسم اچھی غذا نہ ملنے سے بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رُوح اچھی موسیقی نہ پانے سے کثیف ہو جاتی ہے وہ ستار نہایت اعلےٰ بجاتے ہیں اور ہر روز پیانو بجانا اپنی زندگی کا لازمی عنصر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اِن کے مذہبی احساسات کی نسبت لکھنا بہت مشکل ہے۔ مگر یہ عیاں ہے کہ وہ توحید کے قائل ہیں۔

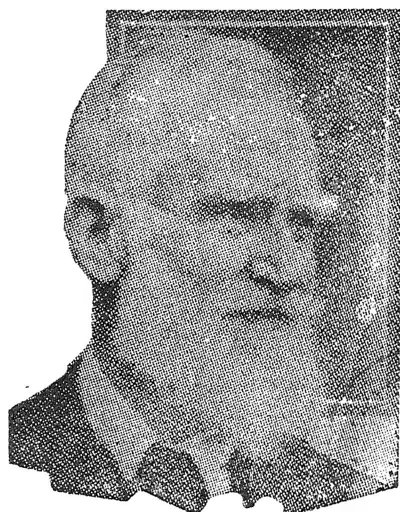
آجکل وہ "جنرل فیلڈ تھیوری" کی دریافت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ہر ہٹلر نے جب یہودیوں کو جرمنی سے نکال دیا تو آئن اسٹائن نے لندن میں رہائش اختیار کر لی۔ اور اُسے اپنا وطن بنا لیا۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ وہاں کے لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں کیونکہ آج وہ سب سے بڑے سائنسدان اور صاحب فراست انسان ہیں۔

مسٹر جارج برنارڈ شا

مسٹر جارج برنارڈ شا دنیا کی ان عظیم الشان ہستیوں میں سے ہیں جن پر بنی نوع انسان جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ آپ کا وطن مالوف آئرلینڈ ہے۔ آپ ۲۶ جولائی ۱۸۵۶ء کو بمقام ڈبلن پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مسٹر جارج کار شا ایک دفتر میں بحیثیت کلرک ملازم تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ الزبتھ کرلی علم موسیقی کی ایک بہت بڑی ماہر تھیں جب ۱۸۷۶ء میں تنگیٔ روزگار کی وجہ سے اُن کے خاندان کو ڈبلن چھوڑ کر لنڈن آنا پڑا تو وہ ایک درسگاہ میں معلمہ موسیقی مقرر ہو گئیں۔

جارج برنارڈ شا ابتدائی تعلیم کے لئے ڈبلن کے ایک اسکول میں بھیجے گئے۔ حالات ایسے نہ تھے۔ کہ وہ اعلےٰ تعلیم حاصل کر سکتے۔ اس لئے جب ان کا سن پندرہ برس کا ہوا۔ تو انہیں اپنا پیٹ پالنے کے لئے ایک دفتر میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ متواتر پانچ برس بحیثیت کلرک کے وہ دنیا کی تگ و دو کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور آخر ۱۸۷۶ء میں دنیا کی جدوجہد سے تنگ آ کر اپنے والد کے ساتھ لنڈن واپس چلے گئے۔

ارشنل ناٹ کے دیباچہ میں وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ "میں ۱۸۸۱ء تک لنڈن میں ایڈیسن ٹیلیفون کمپنی میں کام کرتا رہا۔ اور دنیا کی تگ و دو میں مصروف کار رہا۔ اس حالت میں بھی میں نے اپنا پرائیویٹ مطالعہ جاری رکھا۔"



۱۸۸۰ء میں ان کی پہلی کتاب ارشینل ناٹ چھپی مگر وہ مقبولِ عام نہ ہوئی ۱۸۸۱ء میں مسز اینی بیسینٹ کے رسالہ اور کارنر میں انکا افسانہ لو امنگس ارٹسٹ قسطوں میں چھپنا شروع ہوا۔ اس کتاب میں انکا دعوٰے یہ ہے کہ ساس اور بہو خواہ کتنی ہی امیر کیوں نہ ہوں۔ ایک مکان میں صلاحیت سے نہیں رہ سکتیں۔

۱۸۸۲ء میں ان کا افسانہ آن سوشل سوشلسٹ چھپا مگر تھوڑی دیر کے بعد معدوم ہوگیا۔ اور آج اسکا سراغ بھی نہیں ملتا۔

۱۸۸۴ء میں مسٹر شا فیبین سوسائٹی میں بطور ممبر شامل ہوئے۔ یہ ایک سوسائٹی تھی جو ملوکیت کیخلاف پروپیگنڈا کرتی تھی۔ انہوں نے سوسائٹی کے لئے متعدد پمفلٹ اور رسالے لکھے۔ جو لوگوں میں مفت تقسیم کئے گئے۔ وہ بازاروں میں سوسائٹی کے اصولوں کا پرچار کرتے اور وعظ و تلقین سے لوگوں کو بتاتے کہ امیروں کے ہاتھوں غریبوں کی کیا گت بن رہی ہے۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے ایک رسالہ کا اجرا کیا جس کا نام فیبین ایسیز تھا۔ اسکا پہلا مقالہ افتتاحیہ اکنومیکس بیسیز آف سوشلزم اس شان کا تھا۔ کہ یورپ کے تمام رسائل نے اپنے اپنے رسالوں میں اسے دوہرایا۔ امریکہ میں اس مقالہ افتتاحیہ سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ بڑے بڑے رسالوں اور اخباروں کے مالکوں نے انہیں مدیر کی اسامی پیش کی۔ مگر انکی پرجوش طبیعت اس امر پر قانع نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنے دوست مسٹر ولیم آرچر کے اصرار پر پال میل گزٹ کی نامہ نگاری قبول کی۔ مگر اس پر بھی انکی طبیعت کو زیادہ دیر استقلال نہ ہوا۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۰ء تک وہ رسالہ اسٹار میں کارنیٹو ڈبلیو کے فرضی

نام سے مضامین لکھتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے وہ شہرت حاصل کی کہ بچہ بچہ ان کو جانتا تھا۔ ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۵ء تک سیٹر ڈے ریویو میں وہ ڈرامہ پر تنقیدی مضامین لکھا کرتے تھے باوجود اس شہرت کے جو وہ حاصل کر چکے تھے۔ انکی طبیعت کو سکون نہ تھا۔ ۱۸۹۲ء میں ان کا پہلا ڈرامہ وڈورز ہولز انڈیپنڈنٹ تھیئٹر میں مسٹر جے۔ ٹی۔ گرین کی نگہداشت میں دکھلایا گیا۔ عام لوگوں نے اس کی قدر نہ کی۔ مگر صاحب فراست جان گئے کہ لکھنے والا ایک خاص دل و دماغ کا انسان ہے۔ ۱۸۹۳ء میں انہوں نے اس کمپنی کے لئے فلانڈرا اور نیو مین لکھے۔ دونوں ڈراموں کا مقصد ابسنزم کی تعلیم کو ظاہر کرنا تھا۔ مگر مضمون اسقدر دقیق تھا کہ عوام میں اسکا مقبول عام ہونا معجزہ سے کم نہ تھا۔

۱۹۰۲ء میں لوگوں کے اصرار پر انہوں نے مسز وارنز پروفیشن لکھا۔ مگر محکمہ ترجمہ نے اس کے چھپنے کی اجازت نہ دی۔ ۵ جنوری ۱۹۰۳ء کو نیو یارک کے ایک مشہور تھیئٹر نے اسے سٹیج پر دکھلایا۔ مگر ایکٹروں کا چالان ہو کر ان کو سزائیں ہوئیں۔ آج متذکرہ بالا تینوں ڈرامے ان پلیزنٹ پلیز (Unpleasent plays) کے عنوان سے عام طور پر ملتے ہیں۔ اور نہایت اعلیٰ پایہ کے ڈراموں میں انکا شمار ہوتا ہے۔

۱۹۰۳ء میں مس فلورنس نے انکا ڈرامہ آرمز اینڈ دی مین ابرڈین کے مشہور و معروف تھیئٹر میں دکھلایا۔ ڈرامہ میں یہ دکھلایا گیا تھا کہ فوجوں کی شان و شوکت کے لئے کس طرح غربا کا خون کیا جاتا ہے۔ سین بلگیریا میں رکھا گیا تھا۔ مگر ڈرامہ کا مقصود بادشاہوں کے ظلم کو دکھلانا تھا۔ پھر کینیڈا لکھا گیا۔ مگر عرصہ دراز تک اسے کسی کمپنی نے اسٹیج پر نہ دکھلایا۔ آخر

آخر ۱۹۰۵ء میں کیپٹی تھیٹر لنڈن میں وہ اسٹیج پر دکھلایا گیا۔ ڈرامہ دیکھنے کے دوران میں تمام ناظرین چیخ اُٹھے۔ چنانچہ ڈرامہ اس قدر مقبول ہوا۔ کہ شعراء نے اس پر قصیدے لکھے۔ جو لنڈن کے گلی کوچوں میں پڑھے جاتے تھے۔ ڈرامہ میں دکھلایا گیا تھا۔ کہ ایک غریب انسان باوجود ظلم و تعدی کے اپنے ایمان اور اپنے ضمیر کی حفاظت کر سکتا ہے۔ پھر انہوں نے مین آف ڈیسٹنی ابو کین نیور ٹیل اور ڈیول ڈیسیا ئپل لکھے جو لنڈن کے ڈریوری لین میں دکھلائے گئے۔ ڈراموں کا سین امریکن وار آف انڈیپنڈینٹ تھا۔ اسمیں دکھلایا تھا کہ قومیں جوع الارض کیجا طر ملکوں سے کس طرح ہاتھ دھو بیٹھی ہیں۔ انسان قربانی کر کے کس طور پر آزادی حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر کیپٹن براس بونڈز کنورشن لکھا گیا جسکی شہرت یہاں تک پہنچی کہ یورپ اور امریکہ کے لوگوں نے محض مصنف کو دیکھنے کے لئے دور و دراز کے سفر اختیار کئے۔

سیزر اینکلو پیٹرا اور ایڈ میسریل ببسیول انہوں نے ۱۹۰۰ء کے قریب لکھے۔ ان میں دکھلایا تھا کہ کیریکٹر کیا چیز ہے۔ اور کس طرح بن سکتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ ان کا نام لنڈن اور امریکہ میں اس بات کی ضمانت تھا۔ کہ ان کا لکھا ہوا ڈرامہ نہایت اعلیٰ درجہ کی چیز ہو گی۔ پبلشر جب یہ سنتے کہ آپ کوئی نیا ڈرامہ لکھ رہے ہیں۔ یا لکھنے والے ہیں تو فوراً اسکی خرید کا تہیہ کر لیتے۔ اور ان سے شرائط طے کرنے کے لئے امریکہ سے لنڈن کا سفر اختیار کرتے۔ مسٹر ڈارمن اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:۔ میں واشنگٹن کے ایک گاؤں میں تھا۔ جب میں نے ایک اخبار میں پڑھا کہ جارج برنارڈ شا ایپل کارٹ لکھ رہے ہیں۔ اسوقت میرے دل کی خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں

رات بھر نہ سو سکا اور اگلے دن علی الصبح امریکہ سے ...... روانہ ہو کر عازم لندن ہوا۔ منزل مقصود پہ پہنچ کر میں ان کے در دولت پر حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی۔ کہ وہ اپیل کارٹ میرے ہاتھ فروخت کر ڈالیں۔ میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ جب مجھے معلوم ہوا۔ کہ لنڈن کا ایک پبلشر اُسے پندرہ ہزار پونڈ میں خرید چکا ہے"۔

بیں اینڈ سپر مین ۱۹۱۲ء میں ہز میجسٹی تھیٹر میں دکھلایا گیا۔ جب ناظرین نے ہیرو کو یہ کہتے سُنا" کہ کاش میں مسلمان ہوتا" تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ کہ ایک مسیحی ڈرامائسٹ کا اعتقاد اسلام کی نسبت کیونکر ایسا ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بتلانا جملہ معترضہ نہ ہوگا۔ کہ ان کے نزدیک آئندہ آنیوالی دنیا کا مذہب اسلام ہے۔ ان کا اعتقاد ہے۔ کہ اسلام میں وہ خوبیاں ہیں۔ جن پر قومیں چلکر معراج ترقی پہ پہنچ سکتی ہیں۔

ڈاکٹرز ڈائیلیما (Doctors Dillema) ۱۹۲۲ء میں لکھا گیا۔ اس میں انہوں نے یہ حقیقت بیان کی۔ کہ ڈاکٹر لوگ کس طرح غربا کو لوٹ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر دوائی کی جگہ پانی بیچتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر جسکی فیس پانچ روپیہ ہے۔ اس ڈاکٹر سے جسکی فیس دو روپیہ ہے محض اسلئے تشخیص میں اختلاف کرتا ہے۔ کہ وہ زائد تین روپیہ ہضم کر سکے۔ اگر پانچ روپیہ فیس والے کی بھی وہ رائے ہو جو دو روپیہ والے کی ہو۔ تو لوگ خیال کرینگے۔ کہ آخر پانچ روپیہ والے کو بلانے سے کیا حاصل؟ ان کا خیال ہے۔ کہ ڈاکٹروں کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ جب مریض مر جاتا ہے۔ تو ڈاکٹر کہتے ہیں۔ کہ مریض علاج کے ناقابل تھا اور اگر اچھا ہو جائے تو اسکی صحت کو اپنے عمدہ علاج کا نتیجہ بتاتے ہیں۔

تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد انہوں نے متعدد ڈرامے لکھے میجر بار لو حکیم نٹشے کے اس اصول کی ترجمانی کرنے کے لئے لکھا۔ کہ دنیا میں امن کی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ انسان قوت کا مقابلہ قوت سے کرے، زور کو توڑنے کے لئے زور لگائے اور اس اصول پر کاربند ہو کر وہ عمدگی سے زندگی کے دن پورے کر سکتا ہے۔

گیٹنگ میریڈ (Getting meirred) اور دیگر ڈرامے یکے بعد دیگرے نکلتے رہے اور ہر ڈرامے سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا۔ دنیا ان کا لوہا مان چکی تھی ۱۹۲۶ء میں ایپل کارٹ لکھا گیا جس پر انکو نوبل پرائز کا گراں بہا انعام پیش ہوا۔ مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ غریب لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لوگوں کا خیال ہے۔ کہ اگر وہ نوبل پرائز قبول کر لیتے تو انعام کی شرائط کیوجہ سے کئی لاکھ روپیہ کا حق تصنیف جو دیگر کتابوں کا انہیں ملتا ہے نہ لے سکتے۔ بیک ٹو میتھوزولا (Back to mathusula) کا ذکر کرنا یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس میں ملکوں کے عروج اور قوموں کے زوال کے متعلق نہایت دلچسپ پیرایہ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ آج لندن کی شان و شوکت نرالی ہے اسکی آبادی نوے لاکھ کے قریب ہے۔ وہی لندن دو ہزار سال بعد ایک چھوٹا سا گاؤں دکھلایا گیا ہے۔ ایک نو وارد جب اسکی شان و شوکت وسعت آبادی اور رقبہ کا ذکر کرتا ہے تو سننے والوں پر عجیب قسم کا اثر ہوتا ہے۔ وہ یقین نہیں کرتے کہ شہر کی آبادی نوے لاکھ ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ باور نہیں کرتے کہ یہ گاؤں جسکی آبادی بمشکل دو ہزار سے زائد نہیں کسی زمانہ میں اسکا رقبہ سینکڑوں . . . .

میل تھا۔

ان کے سینکڑوں مضامین اخباروں اور رسالوں میں چھپے ہیں۔ قدردان انکو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ متذکرہ بالا ڈراموں کے علاوہ بیسیوں ایسے ہیں۔ کہ اگر دو دو سطریں ان کے متعلق لکھی جائیں۔ تو ایک کتاب درکار ہے۔ مگر میں دی کامن سینس آف میونسپل ٹریڈنگ کے متعلق ذکر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اس میں واضح کر دیا ہے۔ کہ ممبر لوگ محض اپنی شان و شوکت کے لئے میونسپل کمیٹیوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اور کمیٹی کو ذریعہ معاش بناتے ہیں۔

مشہور و معروف جرمن فلسفی انسٹائن نے انکے متعلق جو لیکچر دورانیہ میں دیا اسمیں فرمایا "قدرت نے برنارڈ شا کو ارسطو کا دماغ بقراط کا قلم لقمان کا دل اور سقراط کی زبان عطا کی ہے۔"

ان کے معتقدین کا خیال ہے۔ کہ پرانی دنیا میں ایسا عالم پیدا نہیں ہوا۔

۱۹۲۲ء میں لارڈ برکن ہیڈ نے سیسل ہوٹل میں ڈنر کے موقعہ پر جو برنارڈ شا کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ کہا۔ "شیکسپیئر آپ کے مقابلہ میں ایک طفل مکتب تھا۔"

اناطول فرانس کا خیال ہے۔ کہ جس طرح غذا جسم کے لئے، اور روحانیت روح کے لئے ضروری چیزیں ہیں۔ اسی طرح آدمیوں کے لئے برنارڈ شا کی زیارت از بس ضروری ہے۔

پیرلوتی کا قول ہے۔ کہ برنارڈ شا کی ملاقات سے مجھے وہ فیض حاصل ہوتا ہے۔ جو اندھیری رات میں چلنے والے مسافر کو چاند کے نکل آنے سے۔

مسٹر جارج برنارڈ شا

مسٹر ایچ جی ویلز فرماتے ہیں "بچوں کا شاندار چلن بنانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ برنارڈ شا کے ڈرامے ان کو پڑھائے جائیں۔ اور نوجوانوں کو ازبر یاد ہوں۔"

مسٹر گالز وردی جنکو ۳۲ء میں عمدہ لٹریچر کے لئے نوبل پرائیز ملا تھا۔ کہتے ہیں "میرا اعتقاد ہے۔ کہ شا سے بڑھ کر انشا پرداز اور ادیب کا پیدا ہونا ناممکن ہے"۔

ریڈگر والس کہتے ہیں عمدہ افسانہ شروع کرنے سے پہلے میں ہمیشہ اس امر کی تلاش میں رہتا ہوں کہ مجھے ایک آدھ گھنٹے کے لئے تخلیہ میں ان سے ملاقات ہوجائے میرے افسانہ کی کامیابی کا راز اسی ملاقات میں مضمر ہوتا ہے"۔

راقم الحروف کو ۱۹۲۰-۲۲ء کے دوران میں ان سے کئی بار شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ اور ان کے کئی لیکچر سننے کا موقعہ ملا۔

آپ کا قول ہے۔ کہ میں موجودہ لٹریچر سے بہت بہتر اور افضل لٹریچر پیدا کر سکتا ہوں۔ مگر لوگ جاہل ہیں۔ وہ سمجھ نہ سکیں گے۔ اس لئے میں لوگوں کے ساتھ جکڑا ہوا ہوں۔

ہر روز ایک من لکڑی کلہاڑے سے پھاڑنا انکا معمول ہے۔ وہ لکڑی غرباء کو مفت تقسیم کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ موسم سرما میں مجھے اپنی غربت کے دن یاد آتے ہیں۔ اسلئے میں لکڑی غرباء میں مفت تقسیم کرتا ہوں۔ ایک دن اپنے مکان کے صحن میں وہ حسب معمول لکڑی پھاڑ رہے تھے۔ کہ ایک سینما والا اپنی مشین لئے اس تاک میں گھوم رہا تھا۔ کہ داؤ چلے تو انکی تصویر لے لے۔ مسٹر شا کو یہ بات ناپسند ہے۔ کہ ہر رات ان کی تصویر سینما میں دکھائی جائے۔ .... چنانچہ وہ گھات میں رہے۔ جب داؤ چلا۔ اس شخص کو پکڑ لیا۔ اور اسوقت چھوڑا جب اس نے اقرار

کیا کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔

وہ عادتاً نہایت فیاض ہیں سینکڑوں بیواؤں اور یتیاموں کے وظائف مقرر کر رکھے ہیں اور سینکڑوں ان کے دست کرم کی وجہ سے عمدہ کام کر رہی ہیں مسٹر نارمن کہتے ہیں۔ کہ انگلستان میں کم از کم ڈیڑھ سو...... مفلوک الحال خاندان انکی فیاضی کی وجہ سے شرافت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حال ہی میں آپ نے تمام دنیا کا سفر کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کو پرانی اور نئی دنیا میں بیشتر ملکوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔

مسٹر چارلس ایگڈینبرز نامہ نگار ٹائمز کہتے ہیں۔ کہ مسٹر شا گذشتہ چھبیس سال سے ایک نہایت چھوٹے سے گاؤں میں جہاں نہ بجلی ہے نہ گیس نہ ریلوے ہے مقیم ہیں۔ گاؤں کا نام آیوتھ ہے۔ اور اس کی آبادی نزانوے نفوس پر مشتمل ہے۔ وہ اتنا چھوٹا گاؤں ہے۔ کہ وہاں اخبار تک نہیں ملتا۔ باوجود تحقیقات کے مسٹر چارلس اس بات کا پتہ نہیں لگا سکے۔ کہ مسٹر شا نے اس گاؤں کو سکونت کے لئے کیوں پسند کیا۔ مسٹر شا اپنی بیوی کے ساتھ ہر ہفتہ کی شام کو ساڑھے چار بجے گاؤں میں پہنچ جاتے ہیں اور منگل کی صبح تک وہاں قیام کرتے ہیں۔ انہوں نے گاؤں میں ایک مکان خرید رکھا ہے۔ انکے دوست ان سے وہاں ملنے کے لئے آتے ہیں۔ انکا سب سے زیادہ عزیز دوست مشہور کرنیل لارنس آف عریبیا تھا۔ جس نے اپنا نام تبدیل کر کے انکے نام پر شا رکھ لیا تھا۔ نامہ نگار کا بیان ہے۔ کہ وہ گاؤں جسکو کوئی جانتا نہ تھا آج دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لوگ آپ کو دیکھنے اور ملنے کے لئے آتے ہیں۔

ملنے والے آپ کی اور آپ کے مکان کی تصویر ایک غریب بڑھیا کی دوکان سے شوق سے خریدتے ہیں۔ مسٹر شا نے اس بڑھیا عورت کو جو بہت غریب ہے، مفت تصاویر بیچنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ آپ کو فوٹوگرافی کا ازحد شوق ہے۔ اسلئے اکثر اپنی تصویریں بنا کر بڑھیا کی دوکان پہ پہنچا دیتے ہیں۔ کہ بڑھیا کی مدد ہو جائے۔

گاؤں میں ایک دفعہ ایک مکان کی تعمیر کے متعلق جھگڑا اٹھا۔ گاؤں کی عورتوں میں حسب معمول اس بات کا بہت زیادہ چرچا ہؤا۔ جب آپ کو اس امر کا پتہ چلا تو گاؤں کی کلب میں ایک لیکچر دیا اور کہا " خواتین! انہیں باقاعدہ طور پر جھگڑا کرنا سیکھنا چاہیئے۔ جب آپ کے دل میں خواہش پیدا ہو کہ ایک عورت کو دوسری سے لڑنا چاہیئے۔ تو تم پر واجب ہے کہ جس عورت سے جھگڑا مقصود ہو اسکو کلب میں بلا لیا کرو۔ پھر ایک دوسری سے لڑو جب تمہاری خواہش پوری ہو جائے۔ تو دوسرے کمرہ میں اکھٹی چائے کے لئے چلی جاؤ۔ اس طور پر تمہاری کلب خوب مشہور ہو جائے گی"۔

سفر کے دوران میں جب آپ ہندوستان تشریف لائے۔ تو آپ نے فرمایا۔ "تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی جہاں محض محبت کی وجہ سے حاکم قوموں نے محکوم قوموں کو حکومت کے اختیارات دئے ہوں"۔

آپ کا خیال ہے کہ ہوم رول کا حاصل کرنا لوگوں کے اپنے بس کی بات ہے۔ لوگوں کو اپنی قوت بازو پہ انحصار کرنا چاہئے۔ اور اپنا چلن اسقدر شاندار اور مضبوط بنانا چاہیئے کہ ملنے والا متاثر ہو تمام حکومتیں ایک جیسی ہیں۔ اور سب سے بہتر کسی ملک کی اپنی حکومت

ہے۔ ایک عمدہ اچھی حکومت کسی طور پر بھی کسی ملک کے لئے اُس کی اپنی بُری حکومت کے مقابلہ میں بہتر نہیں ہوسکتی۔

انکا خیال ہے۔ کہ جنگ وجدل انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اسکو مٹانے کی کوشش کرنا محض بے سود اور تضیع اوقات ہے۔ ملک ایک دُوسرے سے کھیل رہے ہیں۔ اور ایک دُوسرے کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر آج تمام توپیں بندوقیں ہوائی اور جنگی جہاز اور دیگر تمام سامانِ حرب ضائع بھی کر دیا جائے۔ پھر بھی قومیں لڑنے سے باز نہیں رہ سکتیں۔ پھر لڑائیاں مکوں سے ہونگی۔ اور قومیں ایک دوسری پر غلبہ پانے کے لئے ازبس تگ و دو کرینگی۔

موجودہ یونیورسٹی تعلیم کے متعلق آپ کا خیال ہے۔ کہ وہ محض فضول اور بیکار ہے "یونیورسٹی نوجوانوں کو کاہل اور بیکار بناتی ہے۔ سوائے اسکے کہ طلبا فارغ التحصیل ہو کر والدین پر بارگراں ہوں اور کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ وہ سوسائٹی کے لئے عضوِ ناقابل کی مانند ہیں۔ وہ اس پھول کی مانند ہیں جس میں خوشبو نہیں وہ اس خوبصورت آنکھ کی طرح ہیں جسمیں بینائی نہیں۔ موجودہ یونیورسٹیاں طلباء کو فضول خرچی، عیاشی اور بددماغی سکھانے کی بہت بڑی مشینیں ہیں"۔

وہ اس یورپین خیال کے مخالف ہیں۔ کہ عورتوں اور مردوں کو ایک جا تعلیم دیجائے

کون جانتا تھا کہ پندرہ برس کا وہ لڑکا جو پیٹ پالنے کے لئے مختلف دفاتر میں صبح سے شام تک دھکے کھایا کرتا تھا۔ ایک دن سب سے بڑا ادیب اور انشاپرداز ہوگا دُنیا

اسکی بیکسی پر روتی تھی ۔ مگر قدرت ہنستی تھی کہ تیرے مصائب چند روزہ ہیں ۔ اور عنقریب تو دنیا کی عظیم الشان ہستی تصور ہوگا ۔

کون کہہ سکتا تھا کہ ٹیلیفون کے دفتر میں کام کرنیوالا لڑکا ایک دن دنیا اور دنیا کی قوموں میں اپنی تصانیف سے ہل چل ڈال دیگا ۔ لوگ ذوق و شوق سے اسکی کتابوں کو پڑھیں گے اور اس پر عمل پیرا ہو کر دُنیا کی بہترین جماعت تصور ہوں گے کسے معلوم تھا کہ پھٹے پرانے کپڑوں والا لڑکا لاکھوں روپوں کا مالک ہوگا ۔ اور شہنشاہ اسکی ملاقات کو عزت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھیں گے ۔

مجھ ایسے ہیچ مدان کے لئے برنارڈ شا کی تصانیف پر تنقید کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے مگر میرے قلب حزیں کو اس عورت کی مثال سے تسکین ہوتی جو ایک سوت کی اٹیٹی کو بغل میں دبا کر یوسف کی خریداری کے لئے گھر سے نکل پڑی تھی ۔

ادبی دُنیا میں بہت سے ایسے صاحب کمال گذرے ہیں جن کی زندگی میں انکی قدر و منزلت کا پورا اندازہ نہ کیا گیا ۔ مگر برنارڈ شا اس معاملہ میں نہایت خوش قسمت واقع ہوئے ہیں ۔ شیکسپیئر کو بھی اسکے زمانے میں ایک ایکٹر سے بڑھ کر رتبہ نہ ملا مگر آج برنارڈ شا کی تصانیف ان کی زندگی میں دُنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں یورپ ، امریکہ ، افریقہ ، آسٹریلیا اور ایشیا کے ملکوں میں انکے نام کی سوسائٹیاں بنی ہوئی ہیں ۔ جہاں انکی تصانیف پڑھی جاتی ہیں اور انکا پرچار کار ثواب خیال کیا جاتا ہے ان کے کلام کے سادہ لفظ افسوں اور مرہم کا کام دیتے ہیں ۔ ہر شعبہ علم سے وہ واقف ہیں ۔ الغرض ان کی تصانیف کا اثر جو عام لوگوں پر ہوا یہ ہے ۔ کہ انسان کو بحیثیت انسان ہونے

کے دوسرے انسان پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ فوقیت صرف تعلیم اخلاق اور کیریکٹر کی ہے اور جس شخص میں یہ باتیں زیادہ ہوں وہ زیادہ قابل تعظیم ہے۔ انہوں نے پے در پے اس یورپین خیال کی تذلیل کی ہے۔ کہ یورپ والوں کو ایشیا والوں پر صرف سفید رنگ ہونیکی وجہ سے فوقیت حاصل ہے

ایک دفعہ ایک بہت بڑے یورپین مصنف نے جو حضرت عیسےٰؑ کے بہت مداح ہیں فرمایا "ایشیا والوں کی سرشت کو سمجھنا ناممکن ہے" برنارڈ شا نے اسکے جواب میں نہایت بے تکلفی سے کہا۔ "وہ شخص جسکی تعریف میں تم دن رات رطب اللسان ہو ایک ایشیائی تھا"

ان کی تصانیف کا اصلی راز اس بات میں مضمر ہے۔ کہ قوموں کی ترقی و انقلاب کا راز انکی اپنی جدوجہد پر منحصر ہے۔ کسی حاکم قوم کی حکومت اس بات کی دلیل نہیں ہے۔ کہ وہ محکوم قوم سے زیادہ ممتاز اور ارفع ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں۔ کہ انسان کی فضیلت اسکی شرافت میں ہے۔ ورنہ وہ درندوں سے زیادہ وحشی ہے۔ اُن کی تعلیم ہے۔ کہ مذہب صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان دوسرے انسان کی خدمت کرنی سیکھے۔ وہ پکار پکار کر اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ۔

خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر، نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گذر جائے سر پہ، پڑے غم کا سایہ نہ اُس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر، خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

اُن کا خیال ہے۔ کہ جس طرح اندھیری رات میں ستارے زیادہ آب و تاب سے چمکتے ہیں اُسی طرح جب دُنیا میں زیادہ مظالم اور گناہ سرزد ہوں تو نیک انسانوں کے عمدہ اعمال دُنیا کو زیادہ منور کرتے ہیں۔

مسٹر جارج برنارڈ شا

اگرچہ اُن کا سن پچھتر سال سے تجاوز کر چکا ہے۔ مگر وہ نوجوان بڈھا اس عمر میں بھی سولہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ آنیوالی نسلیں اس چشمۂ آب حیات سے دو گھونٹ پی کر حیات حاصل کر جائیں۔

آسکر وائلڈ

آسکر فنگل افلاہرٹی ولز وائلڈ ۱۸۵۴ء میں بمقام ڈبلن پیدا ہوا۔ [illegible] والد مشہور و معروف ڈاکٹر تھے۔ جب اسکول میں داخل کرایا گیا۔ تو اُس نے اپنے نام سے لفظ فنگل حذف کر دیا اور بڑے ہو کر صرف آسکر وائلڈ پر اکتفا کیا۔

بچپن میں آسکر کے متعلق عوام کا یہ خیال تھا۔ کہ وہ اپنے بڑے بھائی ولی کی طرح خوبصورت اور ذہین نہیں ہے۔ دونوں بھائیوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی گئی۔ اور دونوں کو شاہی پورٹا اسکول میں بطور بورڈر داخل کرایا گیا۔ داخلے کے وقت اُس کا سن نو سال کا تھا اور یہ وقت تھا کہ تمام ڈبلن سوسائٹی میں ایک قسم کا ہیجان اس وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ کہ اس کے والد مسٹر ولیم وائلڈ پر ایک عورت مس ٹراورز نے ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر رکھا تھا مس ٹراورز ایک مشہور و معروف پروفیسر آف میڈیکل جیورسپروڈنیس کی دختر تھیں۔ اگرچہ واقعات مقدمہ کو آسکر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں مگر اس کا ضمناً ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مس ٹراورز کا بیان تھا کہ ڈاکٹر مذکور نے جب کہ وہ اُس کے زیر علاج تھی۔ کلوروفارم سنگھا کر اُسکی عصمت دری کی۔ اور اس واقعہ کی تشہیر کر کے اُسے بدنام کیا جانبین کی طرف سے مشہور وکلا پیش ہوئے۔ ایک عرصہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ اور یہ مقدمہ ڈبلن کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر ولیم وائلڈ کو دو ہزار پونڈ بطور ہرجانہ ادا کرنے پڑے“

آسکر وائلڈ

آسکر کی والدہ نہایت ذکی اعلیٰ درجہ کی ادیب اور بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ اُسکا تخلص سپینزرانہ تھا۔ اُس کو اپنے شوہر پر اسقدر اعتماد تھا۔ کہ مقدمہ کے فیصلہ کے بعد بھی وہ اُسے بیگناہ اور سازش کا شکار سمجھتی رہی۔ اسکول میں آسکر نے اپنے مطالعہ کو سات سال تک جاری رکھا۔ جب اُسکا سن سترہ سال کا ہوا۔ تو شاہی وظیفہ حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوا۔ جو مقابلے کے امتحان سے دیا جاتا تھا۔ ڈبلن میں اُس کو ٹرنٹی کالج میں داخل کرایا گیا۔

آسکر کے ایک ہم جماعت نے اسکے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ جو "بنش" میں شائع ہوا تھا جس میں اُس نے تحریر کیا ہے۔

آسکر کی عمر تیرہ یا چودہ سال کی ہوگی۔ جب مجھے اس کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میں تقریباً اُسکا ہمعصر تھا۔ وہ اسکول کے کھیلوں میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ کشتی چلانے سے اُسے خاص نفرت تھی۔ طلبا خیال کرتے تھے۔ کہ وہ ایک دلچسپ گفتگو کرنیوالا لڑکا ہے۔ اسکول کے لڑکوں میں وہ جب قصے کہانیاں بیان کرتا تو سب ہنسی کے مارے لوٹ جاتے۔ اس عمر میں بھی وہ افسانہ بیان کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ وہ طبعاً خوش پوشش اور فیاض واقعہ ہوا تھا۔ ظرافت پسندی کو اُسکی طبیعت میں بہت دخل تھا۔ ایک دفعہ ہم گھوڑ دوڑ کھیل رہے تھے۔ کہ میرے گھوڑے نے اُس کے گھوڑے کے ٹکر لگائی وہ گر گیا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا۔ اگرچہ میں نے اُس کو شرارتاً دھکا دیا تھا۔ مگر اس وجہ سے اُسکی طبیعت میں کبھی ملال نہ آیا۔ اور وہ تمام عمر اس واقعہ کو ہنسی میں بیان کرتا رہا۔

ریاضی اور سائنس سے اُسے دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ سائنس اور ریاضی کے

استادوں کی اکثر ہنسی اڑایا کرتا تھا اُس کا خیال تھا کہ ڈکنس کوئی اعلیٰ پایہ کا افسانہ نویس نہیں تھا۔ یونانی زبان میں اُس نے اوائل عمر ہی سے کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ یعقوب جیڈ آئیڈ پلیٹو اور رد جل اُسکو زبانی یاد تھے۔ سرائیڈورڈ سلیو جو اُسکے ہم جماعت تھے۔ بیان کرتے ہیں "تمام اسکول کے لڑکوں کے نام اُسی کے دھرے ہوئے تھے۔ بیسیوں شعراء کے دیوان اُسکو حفظ تھے۔ علم انشاء اور علم ادب میں وہ اتنی قابلیت پیدا کر چکا تھا۔ کہ تمام علماء اُسکے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔"

۱۹۔ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو وہ ٹرینٹی کالج ڈبلن میں داخل ہوا۔ اُس نے کالج میں نمایاں ترقی حاصل کی اور اعلیٰ پایہ کا انشاپرداز شمار ہونے لگا۔ کالج میں کوئی انعام یا وظیفہ ایسا نہ تھا جو مقابلہ میں اُس نے حاصل نہ کیا۔ وہ دن رات مطالعہ میں مصروف رہتا۔ اعلیٰ درجے کے انگریزی مصنفوں کا کلام زبانی یاد کرنے میں خاص دلچسپی لیتا۔ اُسکو سوائمبرن اور جان ایڈنگٹن ہنٹ کی تصنیفات سے گہری دلچسپی تھی۔

مذہبی اور پولیٹکل معاملات سے وہ ہمیشہ کنارہ کشی کرتا تھا۔ اسکا شغل دن رات پڑھنے اور لکھنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور اسکی علمی قابلیت کی وجہ سے ڈبلن میں ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اُسکے بچوں کی دوستی اس نوجوان سے ہو جائے۔ آسکر نے برکلے میڈل کے لئے یونانی میں ایک مضمون پڑھا۔ اور اوّل درجے کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ۱۱ر جولائی ۱۸۷۴ء ڈبلن سے فارغ التحصیل ہو کر اُس نے آکسفورڈ کے داخلے کا امتحان دیا اور اوّل رہا۔ اُس کی کامیابی خاص طور پر آکسفورڈ گزٹ میں شائع کی گئی وہ ماڈرن کالج میں جب کہ اُسکی عمر بیس سال

سے متجاوز تھی۔ داخل ہوا۔ آکسفورڈ میں اُس نے ڈبلن کی نسبت امتیازی خصوصیت پائی ۱۸۷۸ء میں اُس نے ماڈرلنیس میں اعلیٰ انعام حاصل کیا۔ آکسفورڈ میں اسکی شہرت کا آفتاب چمکا۔ اُس سے پہلے یہ سعادت کسی کو نہ ملی تھی اسکا اپنا بیان ہے مجھے آکسفورڈ میں داخل ہونے سے وہ مسرت حاصل ہوئی جو کبھی حاصل نہ ہوئی تھی؟؟؟ آکسفورڈ کے ٹینس لان ایسے ہیں گویا مخمل کا فرش ...... تماشائی خوش ہو جائیں۔ آہ آکسفورڈ جادو بھری فضا ...... اور سنہری روپہلی وادی۔ نہ رعب کا اثر نہ روپے کا لالچ دترات پڑھنے اور لکھنے کے سوا کسی کو اور مصروفیت نہیں۔"

فرینک ہیرس نے اُس سے ایک دفعہ دریافت کیا۔

"آسکر کیا تم نے آکسفورڈ میں محافے سے بڑھکر کوئی استاد دیکھا۔ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔"

ہاں وہاں ایسے استاد ہیں جن کو دُنیا کا استاد کہنا بجا ہے۔ مثلاً وہاں رسکن تھے۔ جن کے پایہ کا مصنف دُنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میں رسکن کو انگلستان کا افلاطون تصور کرتا ہوں۔ وہ سچائی کا پیغمبر تھا۔ پھر وہاں پیٹر تھے۔ وہ ایسے عالم تھے۔ کہ اُن سے بڑھکر کوئی نثر لکھنے والا پیدا نہیں ہوا۔ وہ مجھے میرے بڑے بھائی کیطرح تھے۔ جب وہ بات کرتے۔ تو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ عندلیب باغ میں چہک رہا ہے۔"

ابھی آسکر وائیلڈ نے آکسفورڈ سے ڈگری حاصل نہ کی تھی کہ اُسکے والد ماجد ۱۸۷۶ء میں دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اسکے والد نے اپنی رفیقہ حیات کے لئے سات ہزار پونڈ کی جائداد چھوڑ دی جسکے منافعہ سے وہ غریبانہ زندگی بسر کر سکتی تھیں اُسکی والدہ نے کچھ

رقم اُسکو آکسفورڈ بھیجدی۔ تاکہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اسوقت اسکو روپیہ کی اشد ضرورت تھی۔

۱۸۷۷ء میں آسکر پروفیسر مُہافے کے ساتھ یونان کے سفر پر روانہ ہوُا۔ اس کو یونان اس قدر پسند آیا کہ وہ تعطیلات ختم ہونے پر بھی آکسفورڈ نہ پہنچا۔ کالج کے پروفیسروں نے اسکی غیر حاضری پر پچاس پونڈ جرمانہ کیا۔ مگر جب اُس نے گریب اور ہیوڈ کیٹ کے انعامات اوّل درجہ پر حاصل کئے۔ تو جرمانہ کی رقم اُس کو واپس دیکر جرمانہ معاف کر دیا گیا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا "روم کے سفر کے بعد میں دیوتا منبل کو مارتدی لیو سرا پر اور ہیلین کو علی الترتیب ان دونوں پر ترجیح دیتا ہوں"

جب وہ آکسفورڈ میں تھا۔ تو موسم گرما کی تعطیلات اکثر ڈبلن میں بسر کرتا تھا۔ اور زیادہ تر وقت اپنے پرانے ساتھی ایڈورڈ سلون کے ہاں گذارتا تھا۔ ایڈورڈ سلون بیان کرتے ہیں جب وہ مجھ سے ملتا تو بسا اوقات ایکٹروں اور ڈراموں کا ذکر کرتا۔ اوائل عمر ہی سے اسکی طبیعت ڈراموں اور ایکٹروں سے مانوس تھی۔ وہ ایلن ٹیری کی تعریف میں بجید رطب اللسان تھا۔ لیکن بعد میں مسٹر لنگارٹی اور میری اینڈرسن کو بھی بنظر استحسان دیکھنے لگے۔

ایکونی سینٹ اُس نے پہلے پہل اپنی ہمشیرہ کی یادگار میں لکھی جو بچپن میں انتقال کر گئی تھی اس نظم میں آسکر نے ہمشیرہ کو اس روشنی سے تشبیہ دی ہے۔ جو گھر کو منور کر دیتی ہے۔

اسوقت اُس کا بھائی لنڈن میں ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر مقرر ہو چکا تھا۔ اُس نے آسکر کو مشہور کرنے کی بجید کوشش کی۔ وہ آسکر کی نظم و نثر پر تنقیدی مضامین لکھتا اور مقالہ

آسکر وائیلڈ

افتتاحیہ میں بڑے زور شور سے اس کا ذکر کرتا۔ ٹرنٹی کالج میگزین میں آسکر کی چند نظمیں "کتابا"
کے عنوان سے شائع ہوئیں اور عوام الناس پر اسکا ایک خاص اثر ہوا۔ ۱۸۷۸ء کے اختتام پر
آسکر نے آکسفورڈ سے اوّل درجہ کی ڈگری حاصل کی۔ آسکر کا خیال تھا۔ کہ جس طرح اُسے آکسفورڈ
میں کامیابی ہوئی ہے۔ اس طرح لنڈن میں کامیاب ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس کا اعتقاد
تھا کہ اُسکو کامیابی پر کامیابی حاصل ہوگی مگر اُسکو یہ مقولہ یاد نہیں تھا۔ کہ وہ طلبا جن کو یونیورسٹیوں
میں نمایاں کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ عملی زندگی میں اکثر ناکام رہتے ہیں۔

آسکر زندگی کی خریب کاریوں سے بالکل آشنا نہیں تھا۔ وہ دارالعلوم کے آر
خوشنما پھول کی مانند تھا آرام طلب طلبا رسونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ آکسفورڈ سے وہ نزاکت ساتھ
سیکھ کر آیا تھا۔ خود پسندی کو اسکی طبیعت میں بہت دخل تھا۔ وہ خواہشات نفسانی کی روک
تھام کرنا نہیں جانتا تھا۔ اور لذت شہوانی کا مریض ہونا اس کی فطرت ثانی ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت
اس گڑھے میں کودنے کے لئے تیار رہتا۔ جہاں اُسے حصول لذت کا موقعہ ملتا۔ ان حالات
کے ماتحت اسکے لئے زندگی کی کشمکش اور جنگ و دو میں ترقی اور کامیابی کا کیا موقعہ ہو سکتا تھا۔

آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہو کر وہ لنڈن میں مقیم ہو گیا۔ جہاں کہیں وہ جاتا۔ مسز لنگٹری کی
خوبصورتی کی تعریف کرتا۔ اور کہتا۔ کہ وہ تو وینس دیوی سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ لیڈی ایپی
کے اخلاق کے متعلق تعریفوں کا پل باندھتا۔ ان تعریفوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ تمام شہر میں
مشہور ہو گیا۔ سوسائٹی کے ہر فرد بشر کے مکان کا دروازہ اُسکے استقبال کے لئے ہر وقت کھلا
رہتا۔ اُسکا تعارف نہ صرف ایکٹر اور ایکٹریسوں سے ہو گیا۔ بلکہ اسکو اس بات کا فخر تھا۔ کہ لارڈ

آسکر وائلڈ

لٹن، لیڈی شیروبری۔ لیڈی ڈارتھی نیویل۔ نیویل۔ لیڈی ڈیگبی۔ مسز جیوین۔ ہارڈی، مسٹر بریڈ شا
ہر ونگ۔ سوائنبرن اور میتھیو آرنلڈ اسکے ذاتی دوستوں میں سے ہیں۔ مسٹر فیبرین جن
لوگوں کو اہل دماغ اور اہل قلم سے ذرا بھی رغبت تھی۔ وہ انہیں خوب جانتا تھا۔ اور ان سب
لوگوں میں بہت ہردلعزیز تھا مگر اس ہردلعزیزی کی وجہ سے آسکر کی مالی حالت میں اضافہ
نہ ہوا۔ بلکہ اس کو احباب کی خاطر و مدارات میں زیادہ خرچ کرنا پڑتا وہ باتوں کا دھنی
اور کام چور ہو گیا۔ اسے بہت زیر بار ہونا پڑا اور تھوڑی بہت آبائی جائیداد جو اسے
ترکہ میں ملی تھی۔ وہ بھی گرو رکھنا پڑی

اس میں کلام نہیں کہ لنڈن میں مارس اور روسلر کی محبت سے اسے وہ فائدہ حاصل ہوا
جسکا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ پہلے وہ ایک اس پھول کی مانند تھا۔ جو ابھی کتم عدم
میں ہو۔ مارس اور روسلر کی صحبت نے شبنم کا کام کیا۔ اور غنچہ ناشگفتہ کو ہمیشہ کے لئے
وا کر دیا۔

آسکر نے اپنی نظموں کا مجموعہ لنڈن میں شائع کیا۔ اکثر نظمیں ایلن ابری کی شان و شوکت
کی ترجمان ہیں۔ وہ ایک صاحب ثروت اور ذی اقتدار خاتون تھی۔ اسلئے وہ مصنف
اور تصنیف کی ہر جگہ تعریف کرتی جسکا فوری نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بہت جلد مشہور ہو گیا اسمیں
شک نہیں کہ بعض نظمیں نہایت اعلےٰ پایہ کی ہیں۔

اتھینیم نے بعض نظموں کو اس مجموعے سے نقل کرکے جو عزت اسکو اور اس کے مصنف کو بخشی۔
اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جو اتھینیم کی پوزیشن سے واقف ہیں۔ اتھینیم نے ان پر تنقیدی مضمون

لکھا۔ اگرچہ وہ بظاہر کچھ سخت ہے مگر یہ کہنا انصاف سے بعید نہیں ہوگا کہ زیادہ سختی سے کام نہیں لیا گیا۔

آسکر نے امریکہ میں لیکچروں کا ایک سلسلہ قائم کرنیکا فیصلہ کیا۔ اس ارادے سے اس نے امریکہ کا سفر اختیار کیا۔ جب وہ منزلِ مقصود پہ پہنچا تو محصول والوں نے محصول والی اشیا کی بابت دریافت کیا تو اس نے نہایت بے تکلفی سے کہا "میرے پاس سوائے دماغ کے کوئی چیز قابلِ محصول نہیں"

نیویارک میں اُن کے لیکچروں کا عنوان "انگریزی تہذیب کا آغاز اور گھروں کی آرائش تھا"۔

۹-۱۰ جنوری ۱۸۸۲ء کو اس کے ہردو لیکچر چکرنگ ہال میں ہوئے۔ جس میں اسے یہاں تک کامیابی ہوئی کہ میجر پانڈ نے اس کی خدمات دیہات میں لیکچر دینے کے لئے حاصل کیں۔ مگر آسکر ناکام رہا۔۔ اور اپنا پروگرام پورا نہ کرسکا۔ اسے بصد حسرت دیار امریکہ کو الوداع کہنا پڑا۔ نتیجہ اپریل ۱۸۸۳ء میں وہ لندن واپس پہنچ گیا۔ آسکر اپنے ڈرامہ "ویرا" کی کامیابی دیکھنے کے لئے ستمبر ۱۸۸۳ء کو پھر نیویارک پہنچا۔ ڈرامہ میری پرسکاٹ نے یونین تھیٹر میں دکھایا تھا۔ ڈرامہ کو پوری کامیابی نہ ہوئی اور یہ ناکامیابی کوئی تعجب انگیز نہ تھی۔ ڈرامہ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جسے معمولی قابلیت کا انسان نہ لکھ سکتا ہو۔

ستمبر ۱۸۸۳ء کو آسکر نے پھر لندن کو مراجعت کی۔ اس دفعہ اس نے لندن میں لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اور پہلے کی نسبت اس میں زیادہ کامیابی ہوئی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکا۔ ہم اسکی بابت یہ ضرور کہیں گے کہ جب اس کی جیب میں دو تین سو

پونڈ ہو جاتے۔ تو وہ دُنیا و مافیہا سے اس طرح بے نیاز ہو جاتا گویا کہ اُسے قارون کا خزانہ مل گیا۔

جب اُسے لنڈن میں بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تو مایوس ہو کر اس نے پیرس کی جانب رُخ کیا۔ اور فرانسیسی زبان کی تکمیل پر متوجہ ہوا۔ پیرس میں اُس نے ایک چھوٹے سے ہوٹل "کوے والیٹر" میں قیام کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں تمام اہلِ قلم سے تعارف ہو گیا۔ وکٹر ہیوگو سے لیکر پال فورس تک اُس کے دوستوں میں تھے۔ پیرس کی اقامت کے زمانہ میں اُس نے اس قدر مطالعہ کیا۔ کہ فرانسیسی پر وہ مادری زبان کی طرح قادر ہو گیا۔ علاوہ بریں اس نے ڈراما "ڈچیز آف پاڈوا" پیرس میں لکھا۔ یہ ڈراما ویرا سے بھی ادبی حیثیت کا ہے ۱۸۹۱ء میں وہ اُسکے زیرِ نگرانی نیویارک میں دکھایا گیا۔ مگر وہ مقبولِ عام نہ ہوا۔ چند ماہ کے بعد آسکر لنڈن لوٹ آیا۔ اور چارلس اسٹریٹ میں اپنی والدہ کے مکان کے پاس ایک مکان میں چند کمرے کرایہ پر لیکر مقیم ہو گیا۔ اُسکی والدہ کو اُسکا سارا کلام زبانی یاد تھا۔ اور اُسے یقین تھا کہ اُسکا بیٹا دُنیا میں کامیاب انسان ثابت ہو گا۔

آسکر فطرتاً نہایت فضول خرچ واقع ہوا تھا۔ اُس کی خواہش تھی۔ کہ نہایت عمدہ مکان ہو۔ نفیس لباس ہو۔ پُر تکلف کھانے ہوں لطیف شراب ہو۔ دوستوں کی مجالس ہوں سازندے ہوں اور عشرت فراواں ہو۔ مگر بغیر کافی آمدنی کے یہ کس طرح ممکن تھا۔ ہر وقت یہی خطرہ تھا۔ کہ اُسکی شہرت کا جہاز غربت کے دریا میں نہ ڈوب جائے۔ آخر سوائے شادی کے کوئی اور تدبیر اُسے نظر نہ آئی۔ آسکر نے مس کانسٹینس لائیڈ سے عقد کر لیا۔ جو ایک بیرسٹر کیوسی کی

آسکر وائیلڈ

صاحبزادی تھی۔ مس کانسٹینس کی ذاتی آمدنی چند سو پونڈ سالانہ تھی۔ اور آسکر کی فضول خرچی کے
مقابلہ میں بالکل ناکافی تھی۔ میاں بیوی نے ٹائٹ سٹریٹ کے ایک مکان میں رہنا شروع
کیا۔ مگر آسکر کی لاابالی طبیعت کو کس طرح سکون و قرار ہو سکتا تھا۔ وہ اس نو گرفتار پرندے
کی طرح تھا۔ جو پر پھڑ پھڑاتا ہو مگر رہائی دشوار ہو۔

وہ لوگوں کی دعوتیں قبول کرتا۔ اور بغیر بیوی کے اکیلے ہی شریک ہوتا۔ وہ بیچاری گھر
پر رہتی تھی کہ خداوند تعالے نے بچے عطا کئے۔ اور وہ ان میں مشغول ہو گئی۔

فرینک ہیرس بیان کرتا ہے۔ کہ ۱۸۸۸ء میں آسکر بے طرح موٹا ہونا شروع ہو گیا۔ اس کے جسم
سے ایک خاص طرح کا پسینہ بہنے لگا جس کی وجہ سے اس سے نفرت ہونے لگی۔ مگر اس کے
باوجود خواتین کی مجلس میں اسکی ہر دلعزیزی کم نہ ہوئی۔ ایک دفعہ مسز جیون نے مجھ سے دریافت
کیا کیا تم آسکر کو جانتے ہو؟ وہ کس قدر قابل اور ہوشیار انسان ہے۔ اور جب میں نے بتایا
کہ آسکر سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔ تو اسکی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

امریکہ کے ایک پبلشر نے لکھا۔ کہ وہ ایک لاکھ لفظوں کا افسانہ لکھیں اور پبلشر مذکور
پانچ ہزار ڈالر بطور اجرت پیشگی کریگا۔ آسکر نے بے تکلفی سے جواب دیا کہ انگریزی زبان
میں اتنے الفاظ نہیں ہیں۔ اس لئے وہ افسانہ لکھنے سے معذور ہے۔ ۱۸۸۶ء میں اسکی زندگی
میں ایک بہت بڑا انقلاب ہوا۔ اسکے ہاں دو بچے پیدا ہو چکے تھے اور چاہیے تو یہی تھا کہ وہ
متانت سنجیدگی اور امن کی زندگی بسر کرتا۔ مگر اسکی زندگی وحشیانہ اور آوارہ ہوتی گئی۔
۱۸۸۶ء کے قریب لنڈن میں اسکے متعلق عجیب و غریب چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں

آسکر وائیلڈ

جب اسکی کتاب ڈبلیو ایچ کی پورٹریٹ ایک میگزین میں چھپی تو عوام الناس کے شکوک یقین میں تبدیل ہو گئے۔ اسمیں شک نہیں کہ شروع ہی سے لوگ اُسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مگر ۱۸۹۱ء میں جب اُسکی دوسری کتاب ڈورین گرے چھپی۔ تو لنڈن میں اُسکے خلاف ذاتیہ مظاہرے ہونے لگے۔ اور سوسائٹی میں اسکی مخالفت کار ثواب ہو گئی۔ اسکی موت کے بعد ڈورین گرے کی تصویر کے متعلق خیالات تبدیل ہو گئے۔ اور اب وہ نہایت بلند پایہ کتاب تصور ہوتی ہے۔ قابل مصنف دیگر باتوں کے علاوہ اسمیں [illegible] کہ گناہوں کے مرتکب ہونے سے انسان کے چہرے پر ایک تغیر سا رونما ہوتا ہے۔ ڈورین گرے نے اپنی آدم قد تصویر ایک کمرہ میں چھپا رکھی ہے۔ وہ ہر روز اُسے دیکھتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے کہ تصویر پر خطرناک اور مہیب تغیر واقع ہو رہا ہے۔ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ آخر تنگ آکر خودکشی کر لیتا ہے۔ فرینک ہیریس لکھتا ہے "ڈورین گرے میں شروع سے آخیر تک وہ شراب بھری ہے جو ہر ایک کو سرشار کر دیتی ہے۔ عوام کو امید تھی۔ کہ آسکر عنقریب کوئی ایسی کتاب لکھے گا۔ جو اسکی بدنامی کے دھبوں کو دھو ڈالیگی۔ چنانچہ اس نے ۱۸۹۳ء میں فرانسیسی زبان میں ڈراما سلیمون لکھکر لوگوں کی اُمید دل کو پورا کر دیا اور اسکے پیچھے بعد دیگرے اعلیٰ پایہ کے متعدد ڈرامے لکھے جن کو دیکھکر اہل قلم و اہل دماغ حیران رہ گئے۔ قدرت نے اس شخص کو کیسا دماغ ودیعت کیا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں سبنہرا نے اُسے پیرس کے اسٹیج پر دکھایا۔ اور پریذیڈنٹ فرانسیسی جمہوریت تین مرتبہ متواتر دیکھنے کے لئے آئے۔

مسٹر رابرٹ لوالس کا خیال ہے۔ کہ سلیمون سے بہتر ڈراما آجتک کسی زبان میں نہیں

لکھا گیا۔ مصنف کو خود اس بات کا احساس تھا۔ کہ سلیمون اسکے بہترین ڈرامونمیں سے ہے سلیمون انگلستان میں مقبول عام نہ ہوا۔ جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ آسکر نے ڈرامہ میں مذہب پر ایک کاری ضرب لگائی تھی۔ انگلستان کے لوگ اسوقت مذہبی عقائد کے پابند تھے۔ لوگوں کا خیال تھا۔ کہ محض انکے جذبات کو ٹھیس لگانے کے لئے یہ ڈراما لکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ڈائرکٹر آف پلینیر نے اسکو اسٹیج پر دکھانے کی اجازت نہ دی۔ اہل جرمن کو ڈراما بہت پسند آیا۔ اور انہوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اسٹیج پر دکھایا۔ وہاں اسکی اتنی قدردانی ہوئی۔ کہ تمام یورپ میں انکی ساکھ قائم ہوگئی۔ اہل انگلستان کو رشک بلکہ حسد ہوا کہ انکا اپنا مصنف اس پایہ کی کتاب لکھے۔ اور وہ مستفید نہ ہوں۔ فوراً انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ اور لندن کی تھیٹر میں دکھایا گیا۔ آج سلیموں کا ترجمہ تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں ہوچکا ہے۔ اور اس کا لب لباب حافظ کے ایک شعر میں پوشیدہ ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر مے کنند
چوں بخلوت مے روند آں کار دیگر مے کنند

فرینک ہیرس نے ۱۸۹۳ء میں ایک دعوت دی جسمیں آسکر کو بھی مدعو کیا۔ آسکر اپنے ایک دوست کو ہمراہ لائے۔ جو ایک کم ظرف لڑکا تھا۔ کھانے کے دوران میں وہ نوعمر دوست آسکر سے ناراض ہوگیا۔ حتیٰ کہ اس سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ آسکر اس کی منتیں کرتا۔ مگر وہ کسی بات پر راضی نہ ہوتا۔ فرینک ہیرس نے آسکر کو کہتے سنا "للہ مجھے معاف کردو۔ مجھے مغالطہ ہوا ہے۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا" مگر وہ راضی نہ ہوا

اور کھانا چھوڑ کر چلا گیا۔ لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ایک نوعمر جاہل کم ظرف لڑکے اور آسکر میں کونسی بات مشترک تھی۔ جو اُن میں دوستی قائم رکھتی۔ ایسی باتوں سے لوگ اُس سے متنفر ہونے لگے۔

مسٹر الیگزینڈر کے اصرار پر انہوں نے ڈراما لیڈی ونڈرمیئرز فین لکھنا شروع کیا۔ مسٹر الیگزینڈر نے انہیں سو پونڈ کا نوٹ دیا۔ اور وعدہ لیا کہ اگر وہ ڈراما جلد شائع کر دیں تو ایک معقول رقم بطور ہدیہ پیش کیجائیگی۔ پہلے دن جب ڈراما سٹیج پر دکھایا گیا۔ تو عوام نے پسند نہ کیا۔ اسکو سمجھنے کے لئے دماغ کی ضرورت تھی۔ اور عوام ایک عمدہ اور ارفع چیز کے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ دوسرے دن وہی ڈراما پھر دکھایا گیا۔ لنڈن کے بہترین مصنف دیکھنے کے لئے آئے۔ اور انہوں نے دل سے اعتراف کیا۔ کہ مصنف نے وہ چیز پیدا کی ہے۔ جو ادبی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کر دے گی۔ بعض نے کہا۔ کہ وہ شیکسپیئر کے ڈراموں مچ ایڈو اور اینی تھنگ لائک اٹ سے بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ پنچ نے اس پر بلند پایہ تنقیدی مضمون لکھا۔ اور لوگوں کے دلوں میں اُسکی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ جن دنوں متذکرہ بالا ڈراما دکھایا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ تمام لنڈن آسکر کے قدموں میں ہے۔ لوگ محسوس کرتے۔ کہ لنڈن میں ایک بہترین اہل قلم ہو گذرے ہے۔ دی ہیپی پرنس اینڈ ادر سٹوریز ۱۸۹۱ء کے قریب چھپیں۔ آسکر کو چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ وہ کہانی میں اس قسم کے جذبات پیدا کر دیتا کہ پڑھنے والے متاثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

آسکر وائلڈ

لارڈ آرتھر سیول کرائم اینڈ ادر سٹوریز" متذکرہ بالا کہانیوں کے کچھ عرصہ بعد چھپیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ بقول ایچ۔ جی۔ ویلز وہ ایک قادر الکلام شخص تھا۔ اسکی گفتگو کی ہوئی تاثیر اس بلا کی ہوتی کہ سننے میں ہی سرشار کر دیتی۔ پیمانوں میں اس طرح چھلکتی کہ دلوں کو موہ لیتی اور بڑے بڑے صوفی انتہائی شوق کے ساتھ اسے چکھنے پر آمادہ نظر آتے۔ ایک دفعہ ایک شخص آسکر کے کلام کی ہجو کر رہا تھا۔ میر بلند بخت دیر تک سنتا رہا۔ اور پھر صرف اس قدر کہا کہ ظالم

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

۱۸۹۱ء میں اسکی کتاب "انٹینشنز" بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلی۔ اسمیں مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اور نہایت عجیب مقالے درج کئے گئے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں پہلی بار آسکر کی ملاقات لارڈ ڈگلس سے ہوئی۔ آسکر کی عمر ۳۶ سال کی تھی اور لارڈ کا سن ۲۱ سال کا۔ ڈگلس نحیف طبیعت کی طرح نازک اور حسین تھا۔ وہ اس قدر خوبصورت تھا کہ لوگ اسے فرشتہ سے مشابہت دیتے تھے۔ وہ اپنی والدہ کی طرح ذکی تھا۔ اور اسے علم و ادب شعر اپنی والدہ سے ورثہ ملے تھے پہلی ہی ملاقات میں آسکر اسکا گرویدہ ہو گیا۔ وہ دن رات اسکی خاطر مدارات میں مشغول رہتا ہوٹلوں میں پر تکلف دعوتیں دیتا۔ اور لارڈ ڈگلس کے ہر حکم کی تعمیل اپنے اوپر فرض سمجھتا۔ قدرتی طور پر ضیافتیں اور مدارات بغیر روپیہ کے سر انجام نہیں ہو سکتی تھیں۔ اسکی آمدنی میں کافی کمی ہو چکی تھی لوگوں میں عجیب قسم کی چہ میگوئیاں شروع ہونے لگیں۔ اور پرانی داستان جسے لوگ بھول چکے تھے پھر دلوں میں تازہ ہو گئی۔ اس دوران میں آسکر اور لارڈ ڈگلس کے کچھ ناشائستہ خط پکڑے گئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ ڈگلس کو انگلستان چھوڑ کر مصر جانا پڑا۔ جہاں وہ لارڈ کرومر کا سیکرٹری

مفرور ہو گیا۔ مگر ایک سال کے بعد استعفا دے کر وہ واپس آ گیا۔

اسی ضمن میں یہ ذکر کرنا از حد ضروری ہے کہ لارڈ ڈگلس کے والد کوئنسبری کے تعلقات ماں بیٹے دونوں سے بہت کشیدہ تھے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ قصور کس کا تھا ہمیں اس سے بھی سروکار نہیں کہ کون مورد الزام تھا۔ مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہم لارڈ ڈگلس کی کتاب بعنوان "آسکر وائلڈ اور میں" کو نظر استحسان نہیں دیکھتے۔ لارڈ ڈگلس نے اس کتاب میں نہایت نازیبا الفاظ میں اپنے والد کا ذکر کیا ہے۔ اور لوگوں کی نظروں میں انہیں حقیر و ذلیل انسان ثابت کرنے کی بے سود کوشش کی ہے۔ قدرتاً لارڈ کوئنسبری کو یہ ناپسند تھا کہ اُس کے لڑکے کا ایک ایسا دوست ہو جو شکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہو۔ انہوں نے ہر طرح کوشش کی کہ آسکر اور ڈگلس کی دوستی کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر ڈگلس باز نہ آیا۔ اسکی والدہ ہر ناجائز بات میں اُس کی حمایت کرتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے تنگ آ کر بیٹے اور بیوی کو گھر سے نکال دیا۔

آخر لارڈ کوئنسبری انسان تھے۔ اُن کے پہلو میں دل تھا۔ اور دل میں بیٹے کی محبت بھی منت سماجت کی کہ اپنے اطوار سدھار لو۔ مگر بیٹا نوجوان تھا۔ اُسے بوڑھے باپ کی نصیحت پسند نہ آئی۔ تنگ آ کر باپ نے بیٹے کو آخری خط لکھا جس کے بعض حصے لکھے بغیر مضمون کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے لکھا۔

"الفریڈ" میری حسرت و یاس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ جب میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ تم آوارہ زندگی بسر کرتے ہو۔ مجھے تمہارے خط ملے۔ میں ان کا مفصل جواب لکھنے کے لئے تیار نہیں اگر تم اُن کے متعلق بالمشافہ گفتگو کرنا چاہو تو فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ میں تمہارا باپ ہوں یا ورنہ تم اندازہ؟

نہیں کر سکتے کہ میرے دل تمہاری محبت کس درجہ ہے۔

جب تم آکسفورڈ میں فضول وقت گنوا رہے تھے تو تم نے مجھے غلط طور پر یقین دلایا تھا۔ کہ تم سول سروس کے امتحان کی تیاری میں مشغول ہو۔ تم نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ کہ تم فارن سروس میں جانے والے ہو۔ اور آخر فریب کاری سے تم نے مجھ سے روپیہ وصول کیا کہ تم بیرسٹری میں داخل ہو گئے ہو۔ خیال کرو۔ کہ کیا یہ تمام فریب کاریاں ایک سپوت کے لئے جائز ہیں۔ مجھے اب نہایت تکلیف دہ مضمون کی طرف رجوع کرنا ہے۔ میں اس بدنام شخص سے تمہاری دوستی قطعاً ناپسند کرتا ہوں۔ میں نہایت قلق سے لکھتا ہوں کہ اگر تم نے اس شخص سے تعلق نہ کیا تو میں تمہارے اور تمہاری والدہ کے جملہ اخراجات بند کر دونگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ میں تمہیں عاق کر دوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ کہ ایک باپ جب اپنے باپ کے متعلق عجیب و غریب باتیں سنتا ہے۔ تو اس پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس دن جب میں نے تمہیں اور وائلڈ کو اکٹھے دیکھا۔ تو میرے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یقین جانو میں متواتر ایک ہفتہ نہ سو سکا۔ مجھے غم کی وجہ سے اختلاج قلب کا دورہ ہو گیا۔ میں نے سنا ہے۔ جو ممکن ہے غلط ہو۔ کہ آسکر کی بیوی ان واقعات کی بنا پر طلاق حاصل کرنے والی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ میرے بیٹے میرے احساسات کا خیال کرو اور یقین رکھو کہ بعض اوقات اس پریشانی میں میرا جی چاہتا ہے۔ کہ آسکر کو گولی کا نشانہ بنا دوں۔

تمہارا عزیز باپ

کوئینزبری

خط کے جواب میں الفریڈ نے باپ کو بذریعہ تار مطلع کیا "تم عجیب الخلقت انسان ہو" خط

ہیں لکھا ہے میں کبھی ان باتوں پر عمل نہیں کر سکتا۔ میں بالغ ہوں اور آپ کی دھمکیوں کی مجھے کچھ پروا نہیں ہے۔ میں آپ کا خط ملنے کے بعد بارہا متعدد ہوٹلوں میں آسکر کے ساتھ گیا تاکہ لوگ دیکھیں اور سنکر آپ کے غم و غصہ کی آگ زیادہ بھڑکے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ اگر آسکر نے آپ پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیا۔ تو آپ کو سات سال کی سزا ہو سکتی ہے"

لارڈ کوینسبری طبعاً بہت ضدی تھے۔ وہ اپنا بیان دھراتے آسکر پر قبیح الزامات لگاتے ہر جگہ اُسے بدنام کرتے حتیٰ کہ ایک پوسٹ کارڈ پر تمام الزامات لکھ کر آسکر کی کلب میں چھوڑ آئے۔

فرینک ہیرس اپنی کتاب امپریشن اباؤٹ آسکر وائلڈ میں لکھتے ہیں کہ آسکر میرے پاس آیا وہ اضطراب کی حالت میں تھا۔ اُس نے تمام قصہ مجھ سے بیان کیا۔ آسکر کہنے لگا کہ اُسکے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ وہ کوئنسبری پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کرنیوالا ہے۔ اُسکے قانونی مشیر کی یہ رائے ہے کہ اُسکا مقدمہ بہت مضبوط ہے۔ فرینک اس سے بہت متاثر ہوا — اور کہا خدا کے لئے یہ حماقت نہ کر بیٹھنا کوئی جیوری باپ کے خلاف رائے نہیں دیگی۔ تم نہیں جانتے کہ لوگوں کی رائے تمہاری بابت کیا ہے۔ لوگ تمہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کوئی شخص تمہارے حق میں گواہی دینے پر آمادہ نہ ہوگا۔ آسکر میری بات مان لو اور اپنی بیوی کو لیکر فوراً انگلستان سے باہر چلے جاؤ۔ لارڈ کوئینزبری اور اپنے بیٹے کو آپس میں نبٹ لینے دو۔ برنارڈ شا کو میں نے دوپہر کے کھانے پر قہوہ خانہ رائیل میں مدعو کیا ہے۔ وہ نہایت ذی ہوش اور عقلمند آدمی ہے۔ تم بھی اس میں شریک ہونا

اور ہم سب اس پر پھر غور کریں گے۔"

آسکر وقت مقررہ پر اٹیل میں پہنچ گیا۔ ڈوگلس اس کے ہمراہ تھا۔ آسکر کے اصرار پر میں نے تمام قصہ برنارڈ شا سے کہا۔ برنارڈ کلی طور پر مجھ سے متفق تھے۔ مگر الفریڈ ڈگلس بہت برہم ہوا۔ اور جاتے ہوئے کہنے لگا معلوم ہوتا ہے۔ تم لوگ آسکر کے دوست نہیں ہو۔"

برنارڈ شا اپنی کتاب "مائی میمائرز آف آسکر وائیلڈ" میں رقمطراز ہیں۔ اگر آسکر کے اپنے اختیار میں ہوتا تو وہ دعوٰے کرنے کی حماقت نہ کرتا۔ الفریڈ ڈگلس اس پر اس طرح چھایا ہوا تھا وہ کبھی اس پر ڈگلس کی ناراضی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کاش ایسے قابل انسان کا تعارف ڈگلس سے نہ ہوتا۔

آسکر کے دوستوں نے بہت سمجھایا بجھایا کہ دعوٰے سے باز رہو۔ مگر اس نے ان کی ایک نہ سنی۔

دوستوں کے مشورہ کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ لارڈ کوئینسبری نے دعوٰے کے جواب میں ان تمام الزامات کو سچا ثابت کر دیا۔ جو انہوں نے آسکر پر لگائے تھے۔

مقدمہ ۳ اپریل ۱۸۹۵ء کو مسٹر جسٹس کالن کے روبرو پیش ہوا۔ جانبین سے نامور وکلا پیش ہوئے۔ استغاثہ کی طرف سر ایڈورڈ کلارک کیو۔ سی وغیرہ تھے۔ ملزم کے وکلا ہیبز کارسن اور جی۔ ڈی گل تھے۔ آسکر پر کئی دن تک جرح ہوتی رہی۔ اور وہ واقعات جن کا علم چند لوگوں کے سوا کسی کو نہ تھا طشت ازبام ہو گئے۔ آسکر اور ڈوگلس کے خطوط پڑھے گئے۔ جن کو سن کر عوام الناس انگشت بدنداں رہ گئے۔ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا جیوری

نے فیصلہ دیا۔ کہ ملزم نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ عوام الناس کی خیر خواہی کے لئے ہے۔ اس لئے ملزم بری کیا جاتا ہے۔ اور ملک اُس کی کارگذاری کا شکر گذار ہے۔

لارڈ کوئینسبری کی رہائی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس نے آسکر کیخلاف مقدمہ فوجداری شروع کر دیا۔ مجسٹریٹ سر جان برج نے اسکی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ اور پولیس نے اسی شام کو اُسے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔

آسکر کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ اُسے ضمانت پر رہا کرا لیا جائے۔ مگر مجسٹریٹ کو یہ منظور نہ تھا۔ پولیس نے اُس کے دوستوں کی ملاقات کی عرضی بھی نامنظور کر دی۔ حتیٰ کہ اُسے کپڑے تک دینے سے انکار کر دیا گیا۔ مقدمہ پیش ہوا۔ مگر چونکہ جیوری کی رائے متفق نہ تھی اس لئے از سر نو مقدمہ کی سماعت کی تاریخ مقرر ہوئی۔

اس مرتبہ دوستوں کی کوشش بارور ہوئی۔ اور وہ ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔ دورانِ ضمانت آسکر کے عزیز دوست فرینک ہیرس آدھی رات کے وقت اُس کے پاس آئے۔ بعد منت و سماجت کہا "تم انگلستان سے بھاگ جاؤ۔ تمہاری رہائی ناممکن ہے۔ اخبارات اور عوام تمہارے خلاف ہیں جیوری کا ان کی آراء سے متاثر ہونا اغلب ہے۔ میں نے ایک جہاز کا انتظام کر لیا ہے۔ جو ٹیمز میں یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم کل طلوعِ آفتاب سے پہلے انگلستان سے نکل جائینگے۔ میں تمہارے لئے کپڑے اور اشیائے ضروری جہاز میں چھوڑ آیا ہوں۔ کافی روپیہ کا میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ گاڑی دروازے پر کھڑی ہے۔ مقدمہ کی تاریخ ایک ماہ کے بعد ہے۔ میں تمہیں اٹلی سویڈن یا جہاں تم پسند

کر و چھوڑ آؤنگا۔ تمہارے تمام اخراجات کا بھی ذمہ دار ہوں۔ آسکر! پانچ سات سال بعد دُنیا تمام باتیں بھول جائیگی۔ اس دوران میں تم علم کی دوسری کشید کر سکتے ہو کہ ملک تمہیں واپس لینے کے لئے تیار ہو جائیگا۔

لیکن اُسے یہ رائے پسند نہ آئی۔ اُس نے کہا فرینک یہ بزدلی ہے۔

۲۵ مئی ۱۸۹۵ء کا وہ منحوس دن آ گیا جس کا خطرہ تھا۔ شنوائی ہو کر رہی۔ اور اولڈ بیلی کی عدالت سے اُسے دو سال قید با مشقت کا حکم ملا۔ آسکر کے مخلص دوست فرینک کی تشویش کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ روتا پیٹتا۔ اُس نے مرافعے دائر کئے۔ مگر کون سنتا تھا۔ قید میں جیل والوں نے وہ تکلیفیں دیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فرینک ہمیشہ حکام کے پاس جاتا کہ کسی طرح آسکر کو آرام ملے۔ مگر تقدیر کے نوشتے کو کون مٹا سکتا ہے۔ ایام اسیری میں آسکر نے "ڈی پروفنڈس" لکھا۔ وہ اتنا لطیف کلام ہے کہ بقول حکیم برگساں "وہ آسمانی دعائیں ہیں جو ایک ستم رسیدہ کے دل سے نکل کر آسمان کی طرف جاتی ہیں۔"

بالآخر فرینک کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے اس کی سزا میں چھ ماہ کی تخفیف کر دی۔ رہائی کے وقت وہ جیل میں ملا اور آسکر کو ساتھ لے آیا۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ سزا کے بعد آسکر عبرت حاصل کرتا توبہ کرتا۔ اور نئی زندگی کا دور شروع ہوتا۔ مگر جبل گرد و جبلت بزگرد کا مقولہ اس پر صادق آیا۔ رہائی کے بعد اُسے کوئی آدمی اعلےٰ سوسائٹی میں قبول نہ کرتا۔ مگر لا ابالی طبیعت کو اُسکی بھی چنداں پروا نہ تھی۔ فرینک سر پیٹتا سمجھاتا۔ مگر وہ ٹال جاتا اور کہتا

"فرینک میں مجبور ہوں"

فرینک کو دن رات یہی دھن تھی ۔ کہ آسکر کسی طرح پھر لکھنے پر آمادہ ہو جائے ۔ اُس کے لئے اُس نے سینکڑوں تدبیریں کیں ۔ مگر کوئی کارگر نہ ہوئی ۔ آسکر کو لارڈ ڈگلس سے ملنے کی بڑی خواہش تھی ۔ مگر فرینک بضد تھے ۔ کہ اُس سے نہ ملو ۔ آسکر کی طبیعت بے قابو تھی ۔ آسکر نے ایک طویل خط فرینک کو اس معاملہ کی بابت لکھا ۔ جس کا مفہوم یہ تھا

دوگونہ رنج و عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

رہائی کے بعد اُس نے پیرس میں سکونت اختیار کی ۔ اور اپنا نام سبسٹین میلموتھ رکھا ۔ افسوس کہ ایک عظیم انسان ہستی جس کی زندگی بصورتِ دیگر قابلِ تقلید اور باعثِ تعظیم ہوتی ۔ اس طور سے دُنیا سے چل بسی کہ سوائے کفِ افسوس ملنے کے کوئی چارہ نہیں ۔

۱۸۹۸ء میں ریڈنگ جیل کے متعلق جہاں وہ قید تھا ۔ اُس نے ایک نظم لکھی جس کا مطلب یہ تھا ۔ کہ میں نہیں جانتا ہوں ۔ اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہر ایک کو یہی معلوم ہوتا ۔ کہ جو زندان آدمیوں نے بنایا ہے ۔ اُس کی تعمیر میں انہوں نے بے شرمی کی اینٹیں صرف کی ہیں ۔ اور ظلم کی آہنی سلاخیں لگائی ہیں ۔ ہمارے حضرت مسیح دیکھ رہے ہیں کہ آدمیوں کے ہاتھوں اُن کے بھائیوں کی کیا گت بنتی ہے ۔

جیل میں اُس نے "اپالوجی فار ہز لائف" لکھی جو رہائی کے وقت وہ داروغہ جیل کو تحفتہً دے آیا ۔ یہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی ۔ اُس نے اس میں گناہ و ثواب پر نہایت فاضلانہ بحث

کی ہے۔ الغرض وہ بدنصیب انسان گمنامی اور ذلت کی زندگی بسر کر کے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۰۱ء کو پردۂ عدم میں روپوش ہو گیا۔ اور اہل دنیا کے لئے یہ درس عبرت و بصیرت چھوڑ گیا۔ کہ جو لوگ زندگی کی راہ مستقیم سے ذرا بھی منحرف ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے قعر ذلت میں گر جاتے ہیں۔

ہمیں اسکی زندگی کے واقعات سے کچھ تعلق نہیں۔ لیکن اسکی تصنیفات کے متعلق ہم ضرور کہیں گے۔ کہ آرٹ اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کے کلام میں لفظوں کی رنگینی محاوروں کی بندش تمثیلات کی بھرمار استعاروں کے استعمال اور تشبیہ مجازی کو اتنا دخل ہے کہ ایک عالم سے عالم خراج تحسین ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مغرب و مشرق میں اس کا کلام پڑھنے والے موجود ہیں۔ اور اردو ادبیات کے نئے دور پر اسکے اثرات بہت زیادہ ہیں اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کے ادبی کارنامے ابدالآباد تک قائم رہیں گے۔

نپولین اعظم

زمانے نے کس سے وفا کی ہے۔ قدرت کا قانون اٹل ہے۔ جو پیدا ہوا وہ مرے گا۔ اور جو مر گیا۔ پھر زندہ نہ ہوگا۔ سربفلک عمارتیں منہدم ہو کر رہیں گی سورج ہر روز نہایت شان سے مشرق سے طلوع ہو کر نہایت بے بسی سے مغرب میں غروب ہوگا۔ انقلاب کا نام دنیا ہے۔ دنیا میں جان گداز واقعات آئے دن ہوتے ہیں۔ مگر زمانہ کبھی ان واقعات پر آنسو بہا کر ان کی یاد تازہ نہیں کرتا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ تاریخ اپنے آپکو دہراتی ہے مگر اکثر واقعات ان واقعات کا دہرانا گناہ اور جرم قرار دیا جاتا ہے گو تاریخ نگار کے لئے تسکین ضرور ہے۔ کہ وہ واقعات کو تاریخ سے اسلئے اخذ کرتا ہے کہ اُسکے ناظرین ان واقعات سے درسِ عبرت حاصل کریں اور بڑے آدمیوں کی زندگیوں سے نصیحت اندوز ہوں انکے مظالم سے اندازہ کریں کہ دُنیا فانی ہے۔ غرور کا سر نیچا ہے۔ اور وقت کا ابدی مسافر بڑی سرعت سے سبک رفتار گھوڑے پر سوار منزل طے کر رہا ہے۔ جن با جبروت شاہیر کی گرج دُنیا کو ہلا دیتی تھی۔ وہ کس طرح تاریک زنداں میں تڑپ تڑپ کر مرغ نیم بسمل کی طرح چل بسے۔ اچھے آدمیوں کی زندگیاں اندھیری رات میں ستاروں کا کام دیتی ہیں اور ظلم۔ ناانصافی جبر و استبداد وہ کلنک کے ٹیکے ہیں جو صدیاں گذرنے پر بھی صفحہ تاریخ سے نہیں مٹتے:

نپولین اعظم کی عظیم الشان مثال ہمارے سامنے ہے۔ ایک وقت تھا کہ جزیرہ کارسیکا کا یہ غریب لڑکا اس تنگ و دو میں تھا۔ کہ اپنے جسم اور روح کا تعلق برقرار رکھنے کے لئے

غذا حاصل کرے۔ پیرس کے شوقین لوگوں نے بالتفات اسکی اضطراری حالت کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور اسکی بے بسی کو مسکراہٹ سے ٹال دیا۔ وہ اس کے سادہ کپڑوں پر ہنسے اور خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اس کے اطالوی لب و لہجہ کا مسخر اڑایا اور چپ ہو گئے زمانہ گزر گیا اور اسی گدڑی کے لعل کو یورپ نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ فرانس کے لوگوں نے زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ دنیا کے بادشاہ اسکے خوف سے لرزہ براندام ہو گئے اور ان کی سلطنتیں اسکا نام سن کر کانپ اٹھیں مغرور بادشاہوں نے اس کے غصے کو فرو کرنے کے لیئے اسکو "برادر اعظم" کے لقب سے خطاب کیا۔ سفیروں نے اس کے روبرو اپنی جبین نیاز خاک پر رکھی وہ جسکو چاہتا تھا۔ بادشاہ بناتا۔ اور جس کو چاہتا ایک اشارہ سے گمنامی اور ذلت کی گہرائی میں گرا دیتا۔ اسکا محل دنیا کا بہترین محل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مرصع فوارے چاندی اگلتے۔ اس کی کنیزیں جواہرات زیب بدن کرتیں۔ ایران کے قالین زربفت کی چلمنیں اور بدخشاں کے لعل اس کے محل کی آب و تاب میں اضافہ کرتے۔ اٹلی روس۔ انگلستان اور جرمنی کے سفیر اسکی ڈیوڑھی پر ادنے ملازموں کی طرح حاضر رہتے اور اس کے ایک تبسم کو اپنی زندگی کی معراج مسرت سمجھتے۔

زمانے نے حسب معمول اس سے بھی بے وفائی کی وہی شہنشاہ اعظم سینٹ ہلینا میں نہایت بےکسی سے تڑپ تڑپ کر اس دنیا سے چل بسا۔

جزیرہ کارسیکا فرانس کے ساحل سے ایک سو میل دور بحیرۂ روم میں واقع ہے۔ اس جزیرہ کی قسمت میں لکھا تھا کہ دنیا کا نہایت نامور انسان وہاں پیدا ہو کر اس کی شہرت کو ابد الآباد

تک قائم کر دے۔ ان ایام میں جزیرہ مذکور پر اٹلی کی حکومت تھی۔ اور اس لحاظ سے جزیرہ کی زبان
بود و باش رسم و رواج سب کچھ اطالوی تھا۔ ۱۷۶۸ء میں فرانس نے جزیرہ پر فوج کشی کی اور اسے
فتح کر کے اپنی مقبوضات میں شامل کر لیا۔ انہیں ایام میں وہاں ایک کامیاب وکیل چارلس
بونا پارٹ مقیم تھا۔ وہ نہایت خوبصورت جوان تھا۔ اسکی ذاتی وجاہت اور حسب و نسب کی شرافت
کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اس کی خاص وقعت اور توقیر قائم تھی۔ اسکے آباؤ اجداد امیر و
کبیر تھے۔ مگر زمانہ کی گردش کی وجہ سے چارلس کو روزی کمانے کے لئے اپنے قوت بازو پر انحصار
کرنا پڑتا تھا۔ اسکی بیوی ایک یونانی النسل دوشیزہ اور پری پیکر خاتون تھی جسکا نام سیتیلا رامیلینسی
تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار تھی۔ ان کے ہاں تیرہ بچے پیدا ہوئے۔ مگر پانچ
ایام طفولیت میں ہی لقمۂ اجل ہو گئے۔ ان کا مشہور و معروف بچہ جس نے دنیا کی تاریخ میں انقلاب
عظیم پیدا کر دیا۔ کارسیکا کے شہر "آجاکو" میں ۱۵۔ اگست ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا۔ ہونہار بروا
کے چکنے چکنے پات۔ اوائل عمر ہی میں بچے کی رغبت سپاہیانہ کھیلوں کی طرف تھی۔ خاندان
کے دیگر افراد جب مختلف تفریح کے کھیلوں میں مشغول ہوتے تو یہ ننھا سپاہی نوبت بجا کر
اپنے بہن بھائیوں کو دائیں بائیں ترتیب دے کر غنیم پر اس زور سے حملہ کرتا کہ وہ الامان
پکار اٹھتے۔ باپ نے ننھے بچے کا رجحان طبع فوج کی طرف پایا۔ تو کارسیکا کے گورنر کی وساطت
سے مئی ۱۷۷۹ء میں ملٹری اسکول "برین" میں داخل کرا دیا۔

فارغ التحصیل ہو کر بھی نپولین کے تاثرات اس اسکول کی نسبت اچھے نہ تھے وہ راہبوں
اور مانکس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور اسکول کے انتظام کی بے حد مذمت کرتا۔ نپولین کو زبانوں

کے سیکھنے سے بہت نفرت تھی۔ البتہ "تاریخ" اور "پلوٹارچ" کا مذاق تھا۔ سکول کے زمانہ میں اُس نے اپنے کیریکٹر کو اس مضبوطی سے دکھلایا۔ کہ ۱۷۸۳ء میں اسکول کے ارباب بست وکشاد نے سفارش کی۔ کہ اُسے بحری فوج میں لے لیا جائے۔ مگر یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی ۱۷۸۴ء میں بونا پارٹ اور اس کے تین دیگر ہمراہی پیرس کے مدرسہ حربیہ میں بغرض تعلیم بھیجے گئے۔ وہاں نپولین نے بڑی جانفشانی اور محنت سے کام کیا۔ اور اس کی خواہش کے مطابق اسے رسالہ میں بھرتی کر لیا گیا۔ کچھ دیر وہ جونیر لفٹنٹ کے طور کام کرتا رہا ۱۷۸۳ء میں اسکا شفیق والد انتقال کر گیا۔ وہ چھ ماہ کی رعائتی رخصت حاصل کر کے اپنی والدہ کے پاس پہنچا۔ اور اس کا غم غلط کرنے میں حصہ لیتا رہا۔ وہ ۲۱ ماہ تک اپنی رخصت میں اضافہ کراتا رہا۔ حتیٰ کہ خاتمہ پر وہ اپنی فوج سے جو اسوقت ایکسونم میں تھی آملا۔ وہاں فوجی موضوع پر اس نے وہ مضمون لکھے۔ کہ جو آج تک علم ادب کا اعلیٰ نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس نے کراموِل کے متعلق لکھا "وہ بہادر ہوشیار اور مکار تھا۔ اُس نے جمہوریت کے جو اصول شروع شروع میں وضع کئے تھے۔ اپنی ذاتی ہوس جاہ و منصب پر قربان کر ڈالے۔ اس نے طاقت کا مزہ چکھ کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کا تہیہ کر لیا"

ایکسونم میں نپولین ایک فوجی دستہ کا کمانڈر تھا۔ وہاں گرد و نواح کے شہروں میں جو شورش برپا ہوتی۔ وہ اس کی روک تھام کر کے امن قائم کر دیتا۔ وہ ستمبر ۱۷۸۸ء تک ایک سونم میں مقیم رہا۔ یہاں اس نے والٹیر پلوٹارچ سینر رادر روسو کا نہایت عمیق مطالعہ کیا۔ اکتوبر ۱۷۸۹ء میں وہ پھر رعائتی رخصت حاصل کر کے وطن گیا۔ گھر پہنچ کر اُس نے اپنی جو شیلی

طبیعت میں سکون نہ پایا اور وہ اپنے بھائی جوزف کے اصرار پر وہاں کی پولیٹیکل کلب کا ممبر ہوگیا۔ اسکا تیسرا بھائی لوسن بھی وہاں موجود تھا۔ اور ان سب کی دلی خواہش تھی کہ انکا وطن عزیز فرانس کے پنجے سے رہائی پاکر آزادی کا جھنڈا بھی لہرادے۔ تینوں بھائی اسی جوڑ توڑ میں لگے تھے کہ ۳۰۔ نومبر ۱۷۸۹ء کو فرانس نے انہیں تمام اختیارات دے کر ان کے ممبروں کو پارلیمنٹ میں بیٹھنے کی اجازت دے دی اور تمام اوپچشہ ظاہر کر دیا کہ وہ تمام اصلاحات جو فرانس میں رائج ہیں۔ یہاں بسنے والے لوگوں کو ان سے مستفید ہونے کا پورا پورا حق ہوگا۔ اس واقعہ کے بعد وہ فرانس کو وطن کی طرح عزیز سمجھنے لگا۔

رعایتی رخصت کے اختتام پر وہ پھر بمقام ایکسونم متعین کیا گیا۔ اسکے ساتھ اسکا بھائی لوئی بونا پارٹ بھی تھا۔ نپولین نے نہایت اہتمام سے اس کی تعلیم و تربیت کرائی تھی۔ اور اسکا خیال تھا کہ وہ نہایت ذکی اور ذہین ہے۔ اسکے وسائل آمدنی نہایت محدود تھے۔ اس کے گھر سے غربت ٹپکتی تھی۔ اور اسکی زندگی نہایت غریبانہ تھی۔ تاہم وہ اپنے بھائی کی محبت میں سرشار تھا۔ اور ہر روز متواتر سولہ گھنٹے مطالعہ میں مصروف رہتا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے پولیٹیکل سائنس اور فن حرب کا مطالعہ شروع کیا۔ "میچاولی" کے مطالعہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک کمانڈر کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اسکی قوت ادراک اور قوت فیصلہ نہایت زبردست ہو۔ یہ قطعی طور پر لازمی امر ہے کہ اس کے پہلو میں محبت کرنیوالا دل ہو۔ جو حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو اور غریبوں اور بیکسوں کی تکالیف کا اندازہ کرسکے بیرونی واقعات کا اثر اسکی طبیعت پر اس قدر گہرا ہوا کہ اسکی محبت اور دلچسپی فرانس

سے بہت بڑھ گئی ہے۔ ۱۷۹۱ء میں وہ پورا لفٹننٹ ہو گیا۔ مگر بعض واقعات کی بنا پر اُس نے
۱۶ جون ۱۷۹۱ء میں فوج سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد وہ پھر فوج
میں شامل ہو گیا۔ اس کے بہت سے دوستوں نے اسمبلی میں حلف وفاداری لینے سے انکار
کر دیا تھا۔ مگر نپولین نے ۶ جولائی ۱۷۹۱ء کو حلف وفاداری اُٹھایا۔ تاہم اس کا خیال تھا
کہ حکومت کو لوئیس سیزدہم کو تخت پر تمکن کر کے آئینی قائم کر دینی چاہیے تھی۔ اس کے خیالات
جمہوریت کے حق میں تھے۔ وہ ”دوستوں کی آئینی کلب“ کا ممبر تھا۔ اور اکثر کلب کے حق میں تقریریں
کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے ”ویلانس“ میں کلب کا اعزازی لائبریرین مقرر کیا گیا۔ . . . . .
. . . . . . ”ویلانس“ میں اس نے ایک معرکۃ الآرا مضمون لکھ کر ایک
گراں قدر انعام حاصل کیا۔ مضمون کا عنوان تھا کہ ”انسان کی اصلی خوشی کے لئے کون کون
سی چیزیں ضروری ہیں“۔ اُس نے لکھا:۔

”سپارٹن اس لئے خوش تھے۔ کہ ان کے پاس کثرت سے سونا اور اچھے کپڑے تھے
اور وہ ہمیشہ ایسے کام کرتے جو قابل تحسین ہوتے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ قانون قدرت کے اصول
کے مطابق اپنے دن گذارے۔“

فروری ۱۷۹۳ء میں فرانس نے ہالینڈ، انگلینڈ اور سپین کے خلاف اعلان جنگ کر کے اپنے
آپ کو ایک عجیب مخمصے میں گرفتار کر لیا۔ تینوں سلطنتوں نے فرانس کے متعدد شہروں پر
حملہ کر کے فرانس کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس حالت میں جمہوریت کی آنکھیں بونا پارٹ کی طرف لگی
ہوئی تھیں۔ اس نے فوجوں اور رسالوں کو اس طرح پر ترتیب دیا۔ کہ کمشنر اس کی تعریف

میں رطب اللسان ہو گئے۔ انہیں لڑائی کے ایام اسکا تعارف جونٹ۔ مارمونٹ۔ نورین بیجیٹ اور ڈکرٹ سے ہوا جنہوں نے اسکی آئندہ زندگی میں وہ کارنامے انجام دئیے۔ کہ مشرق سے لیکر مغرب تک اسکا نام چمک اٹھا۔

۲۰ مارچ ۱۷۹۴ء کو وہ اٹلی کی افواج کے ہیڈ کوارٹروں میں پہنچ گیا۔ یہاں اُس نے اٹلی پر حملہ کرنیکی تجاویز مرتب کیں۔ اسی اثناء میں اُس نے انگریزوں کو کارسیکا سے نکالنے کا عزم بالجزم کیا۔ لیکن اس میں اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

۱۷۹۵ء کے موسم بہار میں اسکے نام پیرس سے احکام صادر ہوئے۔ کہ وہ لاوینڈی پہنچکر پیادہ فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے اُس نے صحت کی خرابی کی بناء پر عذر کیا۔ اور مئی میں پیرس پہنچ گیا۔ اسکے ہمراہ مارمونٹ جونٹ اور لوئی بونا پارٹ تھے۔ پیرس پہنچکر اُس نے محسوس کیا کہ حکومت کے ارباب بست و کشاد عیش و عشرت کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اس سے وہ نہایت برگشتہ خاطر ہوا۔ اور اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ قسطنطنیہ پہنچکر ٹرکی کے سلطان معظم کی ملازمت حاصل کرنے کے بعد اس کے رسالوں کی از سر نو ترتیب و تنظیم کرے۔ مگر بعض وجوہ کی بناء پر اسے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

۱۷۹۵ء میں اُس نے اٹلی کی مہم کا نیا نقشہ تیار کیا اور ڈائرکٹروں نے اُسے بنظر استحسان دیکھا۔ انہیں ایام میں جب وہ نظم و نسق میں منہمک تھا۔ تو ایک فوجی افسر بیرار کی وساطت سے اسکا تعارف ایک ماہ لقا بیوہ جوزفین سے ہوا جس کے ساتھ اسکی شادی ۹ مارچ ۱۷۹۶ء کو ہوگئی۔ مئی ۱۷۹۶ء کو وہ عازم اٹلی ہوا۔ اسکا جذبۂ جستجو و تجسس انتہائی عروج پر تھا اور

جدائی کے صدمے کو وہ خاص طور پر محسوس کرتا تھا۔ لودھی کے پل پر جو اُسے فتح حاصل ہوئی۔ اس نے اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیا۔ کہ وہ محض انقلاب کا ایک کامیاب جرنیل ہی نہ ہوگا بلکہ وہ کارہائے نمایاں کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ بہر اس اختلاف میں وہ کامیاب ہوا جو مرکزی حکومت نے ساتھ معرض وجود میں آیا۔ فوج کی حالت یہ تھی۔ کہ ان کے جسم پر چیتھڑے بھی نہ تھے اس نے فتح کے بعد ان کو لباس فاخرہ میں ملبوس کر دیا۔ ڈائرکٹروں کو عجیب و غریب تحائف بھیجے اور خالی خزانہ کو بھرپور کر دیا۔ الغرض ۱۴ جنوری ۱۷۹۷ء کو "راولی" کی فتح کے بعد "آسٹریا" نے ہتھیار ڈال دیئے اور آسٹرین حکومت کا تقریباً اٹلی سے خاتمہ ہو گیا۔ یہاں اتنی جگہ نہیں کہ تفصیل کے ساتھ ان مہمات کا ذکر کیا جائے۔ اور اس کی دل ہلا دینے والی تقریریں جو وہ حملے سے پیشتر سپاہیوں کے روبرو کرتا تھا۔ درج کی جائیں۔ اس کے ہر لفظ سے شجاعت و ایثار ٹپکتا۔ وہ صاحب فراست تھا۔ اس کے پہلو میں دل تھا۔ اور قدرت نے اسے بہادری اور فیاضی خاص طور پر ودیعت کی تھی۔ ۱۵ مئی ۱۷۹۶ء کو وہ میلان میں فاتحانہ داخل ہوا۔ اس نے نئی کیثیر اپنی حکومت کو بھیجا جس نے اس کے اقتدار کی ساکھ قائم کر دی۔ جب "بیگو" اور "میڈانا" نے آسٹریا کی سلطنت کے خلاف انقلاب برپا کیا۔ تو اس نے انہیں فوراً اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ان فتوحات سے فارغ ہو کر نپولین کو "ریستات" کی کانگرس میں بطور سفیر بھیجا گیا۔ وہاں اس نے اپنے تدبر کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ پرانے مدبر انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر جب وہ پیرس پہنچا تو رعایا اور حکومت نے اسے سر اور آنکھوں پر بٹھایا۔ پھر وہ انگلستان کے خلاف "فوجوں" کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ فروری ۱۷۹۸ء میں اس نے افواج کا معائنہ کیا اور

وہ اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ تیاری محض معمولی اور ناکافی ہے۔ اس نے ایک خط ڈائرکٹروں کے نام ارسال کیا۔ جس میں تجویز کی کہ جرمنی کی شمال مغربی سرحد کو فتح کر کے انگلستان کی تجارت کا وسطی یورپ سے قلع قمع کر دیا جائے۔ یا مشرق پر حملہ کر کے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ہمیشہ کے لیے دبا دیا جائے۔ ڈائرکٹروں نے اس کی اوّل الذکر تجویز کو ناپسند کر کے مؤخر الذکر تجویز سے اتفاق کیا اور حکم دیا کہ مشرق میں مصر پر حملہ کی تیاریاں کی جائیں۔ اس کے لئے روپیہ اور جہازوں کی ضرورت تھی۔ نہایت اہتمام کے ساتھ یہ امر اخفائے راز میں رکھا گیا۔ حتیٰ کہ انگریز بھی اس خیال میں تھے۔ کہ یہ بیڑا آئرلینڈ یا نیپلز پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ انگریزی جہاز بحیرہ روم کو خالی کر چکے تھے۔ نپولین کو یہ بھی معلوم تھا۔ کہ انگریزی بیڑہ میں دو دفعہ بغاوت برپا ہو چکی ہے۔ اس لئے مصر پر مہم کی تجویز نہایت عقلمندانہ تھی۔

۱۲ اپریل کو اس کے اور ڈائرکٹروں کے درمیان ایک سمجھوتا ہوا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ مصر پر حملہ کر کے انگریزی مقبوضات پر قبضہ جمایا جائے۔ نہر سویز کو کاٹ ڈالا جائے۔ تجویز کو اخفائے راز میں رکھنے کے لئے عام طور پر مشہور کیا گیا۔ کہ نپولین اور اس کے بھائی کو فرانس سے جلا وطن کیا جا رہا ہے۔ مگر حق یہ ہے۔ کہ ڈائرکٹر بھی اس کی قابلیت سے جلتے اور ڈرتے تھے۔ کہ یہ صاحب فراست انسان کہیں سارے فرانس پر قبضہ نہ جمالے۔

۱۹ مئی کو بیڑے نے لنگر اٹھایا۔ متعدد جہاز اٹلی سے آملے۔ چودہ بڑے جہاز تھے۔ بیشمار جنگی جہاز اور تین سو بار برداری کی کشتیاں تھیں۔ تخمینہ جہاز پر سینکڑوں ماہرین فن تھے اور اس کے علاوہ وہ لوگ جو مصر کی اقتصادی حالت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ نوشش

نپولین اعظم

قسمتی سے بیڑا "نلسن" سے بچ کر امن وامان کے ساتھ مالٹا پہنچ گیا۔ اور اس نے آناً فاناً میں مالٹا پر قبضہ جما لیا۔ ایک ہفتہ کے قیام کے دوران میں نپولین نے حکومت کو بدلنے میں کمال کر دکھایا۔ اس نے دارالعلوم کا نصاب مقرر کیا۔ محکموں کا تغیر و تبدل کیا۔ اور شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لئے تجاویز کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ ۱۹ جون کو بیڑے نے پھر لنگر اٹھایا اور ایک دفعہ پھر "نلسن" سے اپنے آپ کو بچاتا ہوا ۲ جولائی کو اسکندریہ پہنچ گیا۔ سلطان المعظم کو جو برائے نام مصر کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ اس مہم کی سرکوبی کے لئے تیار کیا گیا۔ انگریزوں نے اس بات سے خائف ہو کر۔ نپولین سلطان ٹیپو سے سازباز کر کے انگریزی اقتدار کو نقصان پہنچائے گا۔ ٹیپو پر حملہ کر کے اسکی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

نپولین نے جولائی ۱۷۹۸ء میں سکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ اور پرمیڈ کی فتح سے وہ تمام مصر کا مالک بن گیا۔ لیکن نیلسن کی فتح نیل سے اس کے تمام ارادے متزلزل ہو گئے۔ نیلسن نے از سر نو مالٹا پر قبضہ کر لیا۔ ترکی روسی بیڑہ نے کارفو فرانسیسیوں سے چھین لیا۔ اور نپولین کا یہ خواب کہ وہ ہندوستان اور قسطنطنیہ فتح کر لیگا۔ اسے پریشان نظر آنے لگا

ادھر فرانس میں پھر تغیر رونما ہو گیا۔ لوگ لڑائیوں سے تنگ آ گئے اسکے سوا کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا جو ملک میں امن قائم کرے حکومت کے ڈائرکٹروں میں کئی پارٹیاں بن چکی تھیں نپولین کو بھی تمام خبریں پہنچ چکی تھیں اس لئے اُسے مصر کی مہم چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ اس نے پیرس پہنچکر حالات کا بنظر عمیق مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ پیرس کے امن کیلئے دونوں کونسلوں کو سینٹ کلو ڈمیں منتقل کر دیا جائے اُسنے پیرس اور اسکے مضافات میں سپاہیوں کو متعین

کر دیا جنرل "بارنے" اس کی تقلید کرتے ہوئے "گوہیر" اور "مولان" کو جو دو مشہور سرغنہ تھے۔ زیر حراست لے لیا۔ تاہم اگلے دن کونسل کے اجلاس میں ایک کہرام مچ گیا۔ پانچ سو ممبروں نے نپولین کے خلاف بغاوت کا الزام مرتب کیا اور نپولین کو اچھی طرح جھنجھوڑا اور قریب المرگ کر دیا۔ نپولین کے بھائی "لوسن" نے جو کونسل کا صدر تھا۔ اجلاس کو برخاست کر دیا اور خود سپاہیوں کے ساتھ موقع پاکر نکل گیا۔ دونوں بھائیوں نے فوج کو ترتیب دے کر کونسل کے نمائندوں کو بزور شمشیر وہاں سے نکال دیا۔ پیرس والوں نے اس خبر کو خوشی کے ساتھ سنا۔ کیونکہ ان کو یقین تھا۔ کہ وہ صاحب ادراک انسان جس نے اتنی فتوحات حاصل کی ہیں۔ یقیناً امن قائم کر دے گا

میڈم ریلنہیرڈ وزیر خارجہ کی بیوی رقمطراز ہے :

"لوگ نہایت خوش و خرم ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انہوں نے مکمل آزادی حاصل کر لی ہے اور خانہ جنگی کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے"

الغرض اس کا رسوخ اور اقتدار ملک بھر میں اس درجہ بڑھا ہوا تھا۔ کہ وہ پرانے آئین کا خاتمہ کر کے نومبر ۱۷۹۹ء کو فرانس کا پہلا کونسل بن گیا۔ اور وہ ملک کا اصلی معنوں میں حکمران تھا۔ ۱۸۰۰ء کے موسم گرما میں اس نے آسٹریا کو ایسی شکست فاش دی۔ کہ اس کا کچومر نکل گیا اور وہ عہد نامہ "سنویل" پر دستخط کرنے پہ مجبور ہو گیا۔ ۱۸۰۲ء میں روس نے انگلستان کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ ۱۸۰۳ء میں پھر انگلستان کے ساتھ لڑائی چھڑ گئی۔ دو سال تک نپولین اس تگ و دو میں رہا کہ انگلستان کو ایک ایسی ہزیمت دے جس سے اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے ۱۸۰۴ء میں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ مگر اکتوبر ۱۸۰۵ء میں "ٹریفالگر" کی لڑائی

میں جو اسے شکست فاش ہوئی۔ اس سے انگلستان کو کچلنے کا خواب محض ایک سراب رہ گیا تھا۔ ۱۸۰۵ء کے اختتام پر وہ عہد نامہ "سنوئل" کا خاتمہ کر کے اٹلی کا بھی بادشاہ بن گیا۔ روس آسٹریا اور انگلستان نے اسکے خلاف اعلان جنگ کیا۔ لیکن اس نے روس اور آسٹریا کی فوج کو ایسی شکست دی، کہ آسٹریا نے غیر مشروط اطاعت قبول کر لی۔ اگلے سال وہ جرمنی کو شکست دیکر برلن میں فاتحانہ داخل ہوا۔ اور روس کیساتھ صلح کر لی۔ اسکا اصل مقصد یہ تھا۔ کہ وہ کسی طرح انگریزوں کو ایسی شکست دے کہ ان کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہو جائے۔ اس نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اپنے تمام حلیفوں اور ان سلطنتوں کو جو اسکے ماتحت تھیں حکم دیا۔ کہ وہ انگلستان سے کسی قسم کا تجارتی تعلق نہ رکھیں۔ پرتگال نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اسلئے اس نے پرتگال پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا۔ ۱۸۰۸ء میں وہ اسپین اس بنا پر ناراض ہو گیا کہ اُسنے چند جہاز انگریزوں سے کیوں خریدے ہیں۔ اس بنا پر اس نے اسپین پر فوج کشی کی۔ ۱۸۱۰ء اور ۱۸۱۱ء میں اُسکے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ وہ فرانس کا واحد مالک تھا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہمبرگ تک اسی کا قبضہ و اقتدار نظر آتا تھا۔

جوزفین سے جو محبت اور عشق نپولین کو تھا۔ اس کو احاطۂ تحریر میں لانا ناممکن ہے۔ وہ اسوقت یورپ کا شہنشاہ تھا۔ بادشاہ اپنی جبین نیاز کو اسکی دہلیز پر رگڑنا باعث افتخار سمجھتے۔ مگر جوزفین کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اور یہ فکر اسے دن رات گھلائے دیتا تھا۔ وہ بارہا ارادہ کرتا کہ جوزفین کو طلاق دیکر کہیں اور شادی کر لے شہنشاہ اس سے ناتہ کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے۔ مگر حب اولاد پر حب زن غالب تھی۔ وہ ہمیشہ اس خیال کو

ٹال دیتا۔ کیونکہ وہ "جوزفین" کا دل دکھانا گناہِ عظیم سمجھتا تھا۔ وہ ایک زمانے تک ان طفل
تسلیوں سے اپنے دل کو مطمئن کرتا رہا۔ لیکن آخرکار وہ مہلک دن آپہنچا۔ یہ نومبر ۱۸۰۹ء
کا آخری دن تھا۔ اکثر خونیں اندیشے شہنشاہ بیگم کے دل کو دلگیر کرتیں۔ وہ آسمان کی طرف
دیکھتی اور آہ سرد کھینچ کر چپ ہو رہتی۔ وہ "فونٹینبلو" میں مقیم تھے۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے
اور اس موسم سرما کی تند ہوائیں شروع ہو چکی تھیں۔ جوزفین اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھی زار
زار رو رہی تھی۔ نپولین نے بھی تمام دن نہایت سکوت کے عالم میں کاٹا تھا۔ وہ شام کے
وقت کھانے کی میز پر ایک دوسرے سے ملے اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ان میں ایک دوسرے
سے بات کرنے کی طاقت تک نہ تھی۔ دونوں کے دل میں محبت کے تلاطم اٹھ اٹھ کر بیچینیاں
پیدا کر رہے تھے۔ ان میں اتنی بھی برداشت نہ تھی۔ کہ ایک دوسرے کی طرف نظر اٹھا کر
دیکھ سکیں۔ قسم قسم کے کھانے آتے اور بغیر چھوئے واپس کر دئے جاتے۔ دونوں کے
چہروں پر زردی طاری تھی۔ جوزفین اس طرح بیٹھی تھی۔ گویا وہ سنگ مرمر کا ایک بت ہے۔
خدا خدا کر کے کھانے کے مراسم ختم ہوئے۔ ملازم رخصت ہوئے نپولین نے اٹھ کر
دروازہ بند کیا۔ وہ شہنشاہ جو بڑے سے بڑے خطرے سے مرعوب نہ ہوتا تھا۔ ایک
طفل مکتب کی طرح کانپ اٹھا۔ اس نے اسکا ہاتھ لیکر اپنے دل پر رکھ لیا اور بھرائی ہوئی
آواز میں کہا "جوزفین۔ پیاری جوزفین! تم جانتی ہو مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میری زندگی
میں خوشی کے جو چند لمحے گذرے ہیں۔ وہ تمہاری وجہ سے گذرے ہیں۔ مگر میری تقدیر میری
قوت ارادہ سے زیادہ زبردست ہے۔ آہ میں وارثِ تاج و تخت کے لئے بیقرار ہوں

اور فرانس کی محبت مجھے بے چین کر رہی ہے" جوزفین غش کھا کر فرش پر گر پڑی نپولین گھبرا گیا اور مدد کے لئے چلایا۔ کونٹ بوما جلدی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اور دونوں نے اُسے اٹھا کر خواب گاہ میں پہنچایا۔ جب اُسے کچھ ہوش آیا تو وہ بڑبڑا رہی تھی" آہ تمہیں یہ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ تم مجھے قتل نہیں کرو گے"۔

وہ تمام رات اسکی خواب گاہ کے گرد گھومتا رہا ہر گھنٹہ کے بعد اس کے کمرے میں داخل ہوتا اور اسکی نبض کو محسوس کرتا۔ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آخر ۱۵ دسمبر ۱۸۰۹ء کو محل "طلری" کے ایوان میں شاہی خاندان کے تمام افراد جمع ہوئے سلطنت کے اکابر موجود تھے۔ وزراء و امراء مؤدب کھڑے تھے۔ چاروں طرف پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اٹھا اور کانپتی ہوئی آواز میں خطاب کیا۔

"فرانس کی محبت اور رعایا کی خواہشات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ کہ میرا بچہ میرے تخت کا وارث ہو۔ سال ہا سال تک میں اس امید میں رہا۔ کہ شہنشاہ بیگم کے بطن سے مجھے خدا ایک بچہ عنایت کر دے لیکن اب جب کہ میں چالیس سال کا ہوں میری اُمید ختم ہو چکی ہے۔ خدا جانتا ہے۔ کہ طلاق نے میرے دل پر کیا اثر کیا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ میں اپنی پیاری جوزفین کو قربانی کے طور پر بھینٹ چڑھا رہا ہوں۔ مگر جو کچھ میں کر رہا ہوں محض فرانس کی محبت کے لئے کر رہا ہوں۔ میں نے زندگی کے بہترین پندرہ سال اسکے ساتھ گذارے ہیں۔ اور ان کی یاد میرے دل کو ہمیشہ گرمائے گی۔ وہ ہمیشہ "شہنشاہ بیگم" کے لقب سے ملقب کیجا وے گی۔ پیرس میں اسکے لئے ایک شاندار محل مہیا کیا جائیگا

اور تیس لاکھ روپیہ اسکی سالانہ جاگیر ہوگی۔"

جوزفین کانپتی ہوئی اٹھی۔ اور جواب میں کہا:۔

"میں یہاں کوئی تقریر کرنے کے لئے نہیں آئی ہوں۔ بلکہ اپنے پیارے اور معزز مالک کی اجازت سے چند کلمات شکریہ کے ادا کرنا چاہتی ہوں۔ خدا جانتا ہے۔ کہ حضرت شہنشاہ کی محبت کا میرے دل میں ہمیشہ جذبہ رہا ہے۔ ان ہی ہاتھوں نے تاج میرے سر پر رکھا تھا۔ اور آج ان ہی متبرک ہاتھوں نے اسے واپس لے لیا ہے۔ میری خوشی ان کی خوشی میں ہے۔ میرا سر تسلیم خم ہے۔ جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ فرانس کی محبت کے لئے ہے۔ اور اس جدائی کے بعد بھی میری عقیدت حضور سے ایسی ہی رہے گی۔ میں خوب جانتی ہوں کہ اس بارہ میں شہنشاہ معظم کو ایک بڑی قربانی کرنی پڑی ہے۔"

۱۸۱۰ء میں نپولین کی شادی "میری لوئی" شہنشاہ آسٹریا کی دختر سے ہوئی۔ جسکے بطن سے ۱۸۱۱ء میں اسکا اکلوتا بیٹا۔ فرانسس جوزف چارلس نپولین بونا پارٹ پیدا ہوا۔

۱۸۱۲ء میں "زار روس" سے جھگڑا اٹھا جسکی بنا پر اس نے روس پر فوج کشی کی "بُرڈینو" پر اسے ایک عظیم الشان فتح حاصل ہوئی۔ اور اس نے ماسکو پر قبضہ کر لیا۔ لیکن روسیوں نے ماسکو کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ اسے موسم سرما کی شدید برف باری کی وجہ سے واپس لوٹنا پڑا۔ اس سنہ میں اس کی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ شدید سردی کی نذر ہوا۔ اسپین کی مہم بھی اس کے لئے تباہی کا باعث ہوئی جرمنوں نے بغاوت کی

اور آسٹرین اُن سے مل گئے۔ انگریزوں، جرمنوں اور آسٹریوں نے مل کر "لیپزگ" کے مقام پر اکتوبر ۱۸۱۳ء میں اسے شکست فاش دی۔ باوجود اس شکست کے اس کے عزائم میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ اور اگلے سال اس نے غنیموں کی شرائط صلح کو ٹھکرا دیا لیکن اسکی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مارچ ۱۸۱۴ء کو اتحادی فوجیں پیرس میں داخل ہوئے۔ اور اپریل ۱۸۱۴ء میں وہ تخت سے دست بردار ہو گیا۔ مارچ ۱۸۱۵ء کو وہ جزیرہ البا میں بھاگ گیا۔ اور وہاں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ فرانس کے لوگوں نے اس خبر کو نہایت مسرت سے سنا اور اسکے استقبال کے لئے آنکھیں بچھا دیں۔ اُس نے ایک دفعہ پھر مقابلہ کی ٹھان لی۔ مگر ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کو "واٹرلو" کے مقام پر اُسے شکست فاش ہوئی۔

باوجود اس ہزیمت کے وہ نہایت شان اور استقامت کے ساتھ جزیرہ البا میں مقیم تھا۔ ہزاروں لوگ اسکے ایک اشارہ پر جان دینے کو تیار تھے۔ اسکے لائق اور قابل مصاحب اسکے گرد جمع تھے۔ فرانس کی محبت اس کے دل میں موجزن تھی۔ اسکی بیوی اور بچہ پیرس میں مقیم تھے۔ بیشک اگر وہ چاہتا تو نہایت آسانی سے فوجوں کو سمیٹ کر غنیم کی مدافعت کرسکتا تھا۔ مگر وہ یہ برداشت نہ کرسکا کہ فرانس میں مزید خون ریزی کی جائے۔ آخر اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ زندگی کے باقی ایام نہایت امن سے ایک امن پسند شہری کی طرح امریکہ میں گزار دے گا۔ انگریزوں کے جہاز "بیلرفون" کے کپتان "لوئی میٹ لینڈ" نے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ تنہا جہاز پر آجائے تو وہ اُسے نہایت عزت و احترام کے ساتھ انگلستان پہنچا دیگا۔ جہاں اسکا نہایت عظیم الشان استقبال کیا جائے گا۔ اس خیال کو مدنظر رکھ کر وہ صاحب

سمیت تختہ جہاز پر آگیا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا اور انگلستان کے قریب پہنچکر لنگر انداز ہوا
اُسے یہاں آکر معلوم ہوا کہ اسکے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اسے جہاز سے اترنے کی اجازت
نہ دی گئی بیشمار دوسرے جہاز اسکی نگرانی کے لئے متعین کر دئے گئے۔ امیر البحر "لارڈ کیتھ"
کا رویہ ناقابل برداشت تھا۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ اسے سینٹ ہلینا میں نظر بند کیا جائیگا
وہ محض بطور "جرنیل" مخاطب ہوگا۔ اس کے تمام مصاحب اسکے ساتھ نہ جانے پائیں گے
ایک مشہور و معروف انگریز بیرسٹر نے لکھا تھا۔ کہ "یہ قید خلاف قانون، خلاف عقل اور بعید
از انصاف ہے۔"

ایک دوسرے انگریز بیرسٹر نے اسکی گواہی کے سمن کی تعمیل کرنی چاہی۔ مگر لارڈ کیتھ خود
چھپ گیا اور کیپٹن "میٹ لینڈ" کو حکم دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی سمن کی تعمیل نہ ہونے دے
۴۔ اپریل ۱۸۱۵ء کو نپولین نے ایک خط بطور احتجاج لکھا:۔

میں نہایت سچائی سے خدا اور انسانوں کے روبرو اس ظلم کیخلاف صدائے احتجاج
کرتا ہوں جو مجھ پر روا رکھا گیا ہے۔ میں اس ظلم کی مذمت کرتا ہوں۔ جس نے میری ذاتی آزادی
سلب کر لی۔ اور میرے مقدس حقوق غصب کر لئے ہیں۔ میں اپنی مرضی سے تختہ "بیلیرو فون"
پر آیا تھا۔ میں قیدی نہ تھا۔ بلکہ میں انگلستان کا مہمان تھا۔ تختہ جہاز پر آنیکی وجہ کپتان
کی تحریک تھی۔ جس نے مجھے یقین دلایا تھا۔ کہ اسکے پاس میرے اور میرے صاحبوں کے
استقبال کے لئے اسکی حکومت کیطرف سے احکام پہنچ چکے ہیں۔ اور اگر میری مرضی ہو
تو وہ مجھے انگلستان لیجائیگا۔ میں نہایت صدق و صفا کیساتھ انگلستان کے قانون کی

حفاظت میں آ گیا۔ اور جوں ہی کہ میں تختۂ جہاز پر آ گیا ہیں انگریز لوگوں کی حفاظت میں تھا اس لئے اگر گورنمنٹ نے "بیلر فون" کے کپتان کو میرے استقبال کے لئے احکام دئے تھے۔ کہ مجھے اس طرح پھانسا جائے تو یقیناً وہ اپنی عزت و ناموس کھو چکی ہے۔ اور اس نے اپنے جھنڈے کی توہین کی ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے تو بیشک انگریزوں کی شخصیت ان کی آزادی اور ان کی سچائی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے۔ اور وہ "بیلر فون" کی مہربانی" میں ختم ہوئی ہے۔

میں تاریخ سے اپیل کرتا ہوں وہ بتلا سکتی ہے کہ ایک دشمن جس نے بیس سال تک انگریزوں کا مقابلہ کیا اپنی مرضی سے انگریزوں کی پناہ میں آ گیا۔ اس سے وہ زیادہ ان کی عزت و تکریم کا اور کیا ثبوت دے سکتا تھا۔ لیکن انگلستان نے اسکا کیا بدلہ دیا یہی کہ جب اس نے نیک نیتی سے اپنے تئیں ان کے حوالہ کر دیا تو اُسے فریب کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

اس کے باوجود اس کے صبر و استقلال اور دماغی توازن میں فرق نہ آیا۔ ایک دن جب اُسے سینٹ ہلینا لے جا رہے تھے۔ تو اس نے اپنی بیوی اور بچے کی تصویر دکھلائے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ کہنے لگا "میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ ظلم مجھ سے کیوں برتا گیا ہے۔ میری بیوی اور میرا بچہ مجھ سے کیوں جدا کئے گئے ہیں۔ اور آسائش جو ہر فرد کا حق ہے۔ مجھ سے کیوں سلب کی گئی ہے؟"

سینٹ ہلینا میں اسکی زندگی درس عبرت تھی۔ اسکی خوراک نہایت مکروہ تھی اس کے ہر فعل کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔

جب عالی جناب جیمز چیمبرلین آف ویلز سینٹ ہلینا گئے تو انہوں نے نپولین اعظم کا مکان دیکھ کر کہا
بیشک وہ ایک بڑا انسان تھا جس کو ناحق تو انہوں نے سینٹ ہلینا جیسی جگہ میں قید رکھا
وہ نہایت عسرت تنگی اور ذلت کی زندگی بسر کرتا ہوا ۱۸۲۱ء کو فرانس آزادی، آزادی
اور بیوی بچے کی محبت کے نعرے لگاتا ہوا اس دار فانی سے چل بسا۔ اس کی خواہش تھی
کہ اسے اس جگہ دفن کیا جائے۔ جہاں دریائے "سین" کی موجیں اس کے پہلو میں آکر کھیلیں
اسکی محبوب قوم نے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اسکی تجہیز و تکفین کی اور قوموں کو
صاف طور پر بتلا دیا کہ وہ اپنے محبوب بادشاہ کو اپنی زندگی کی ایک متاع عظیم سمجھتے
ہیں۔

"سین" کی لہریں اٹھ اٹھ کر اسکے عظیم الشان مقبرہ میں اسکے معزز قدموں کو بوسہ دیتی ہیں
اور کروڑوں زائرین سر تسلیم خم کرتے عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

بیشک وہ ایک عظیم الشان سپاہی تھا جسکی مثال دنیا کی آنکھوں نے بہت
کم دیکھی ہے۔ وہ بطور تفنن کے ابد الآباد تک زندہ رہیگا آج بھی اسکا کوڈ دنیا میں
فرانس جرمنی اور اٹلی کی راہنمائی کر رہا ہے۔ اسکے پہلو میں ایک شریف دل تھا۔ وہ دوسروں
کی تکالیف محسوس کرتا اور ان کے مصائب پر روتا تھا"

اسکی زندگی کا ہر باب قوموں کے لئے ایک کھلا ہوا سبق ہے۔ کہ عزت خدا کے
ہاتھ میں ہے جسکو وہ چاہتا ہے معزز بنا دیتا اور جسکو چاہتا ہے ذلیل کرا دیتا ہے۔



غازی مصطفےٰ کمال پاشا

تغیرات کا نام دنیا ہے۔ یہاں ایسے تغیرات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں کہ ایک عام فہم آدمی ان کو سمجھ بھی نہیں سکتا، وہ انسان جو تغیرات پیدا کرتے ہیں سب سے زیادہ باعث رحمت و برکت ہوتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے انسان خواہ وہ کسی ملک و ملت سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کے عظیم الشان کارناموں کی بناء پہ اُن کی قدر کرے اور ان کے تجربوں سے فائدہ اُٹھائے۔ اور دیکھے کہ ان کے بلند حوصلوں کے سامنے آلام مصائب کے بادل کس طرح چھٹ گئے انہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے دنیا کو کیسے رشک ارم بنا دیا۔ اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر انہوں نے بنی نوع انسان پہ کیا کیا احسان کئے۔ وہ دیکھے کہ میدان وغا میں انکی شمشیر آبدار بجلی کی طرح چمکی وہ فتحمند ہوئے وہ مغلوب ہوئے وہ قید ہوئے وہ محبوس ہوئے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ انہوں نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ ڈالا۔ جہالت کو دور کیا۔ ملک کے شیرازۂ ملت کو یکجا کیا جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے بڑے تاجداروں نے انکا استقبال کیا اور مہذب دنیا اُنکا نام ادب و احترام سے لینے لگی۔ ایسی شخصیتوں کے پیدا ہونے کے لئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ دُنیا ہر وقت ایسے ناموروں کے لئے چشم براہ رہتی ہے ٥

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

انسان کا اپنا وجود عالم اصغر ہے۔ اسکی ہستی میں بھی آئے دن گوناگوں تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہی وہ تغیرات ہیں جو شخصیتوں سے گذر کر قوموں کے عروج و زوال میں بڑی حد تک دخیل ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے انسان کے متعلق ہم نے پہلی دفعہ سُنا کہ درہ دانیال میں اُس نے کس طرح اتحادیوں کو شکست فاش دی۔ اسی انسان کے متعلق ہمیں بتلایا گیا کہ وہ راہزن ہے۔ ڈاکو ہے چور ہے۔ عورتوں کو قتل کرتا ہے۔ قافلوں کو لوٹ لیتا ہے بچوں کو بیچ ڈالتا ہے۔ اس لئے واجب القتل ہے۔ اس کی اپنی قوم نے اسے پھانسی کی سزا کا مستوجب ٹھہرایا۔ اس کے سر کی قیمت تین لاکھ روپیہ مقرر ہوئی۔ لوگوں کے دلوں میں ہوس نے چٹکیاں لیں۔ کہ ہم نہ کسی طرح تین لاکھ کا انعام حاصل کریں۔ واقعات کو قرار نہیں۔ اسی انسان کی نسبت تھوڑے دنوں کے بعد ہمیں بتلایا گیا کہ وہ مہذب ہے۔ ڈاکو نہیں۔ امن پسند ہے۔ راہزن نہیں۔ نیک نہاد ہے۔ چور نہیں عورتوں کی قدر کرنیوالا ہے۔ عیار نہیں روشن خیال ہے۔ جاہل نہیں۔ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہے۔ اور اس لئے واجب القتل نہیں۔

ارتقا کا نام دنیا ہے۔ واقعات آسانی سے فراموش کئے جا سکتے ہیں۔ اسی انسان کو آج دنیا کا سب سے بڑا انسان کہا جاتا ہے۔ شہنشاہ مدبر، وزیر عالم، مؤرخ اور مصنف اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اسکی زندگی کے ہر واقعہ کی جستجو کرنا علم کی خدمت

تصور کرتے ہیں۔ اسی الشان کو شہنشاہ جارج پنجم نے گیلی پولی کی تاریخ کی ایک کاپی پیش کی اور سرورق پر سونے کے حرفوں سے ذیل کی پیشکش لکھی:۔

"دنیا کے سب سے بڑے کمانڈر فیاض دوست۔ شریف دشمن سرکار عالی غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے حضور میں ہم اپنی سچی دوستی کے ثبوت میں یہ کتاب "ہدیۃً" پیش کرتے ہیں"۔

مصنفوں نے اسے سکندر اعظم اور نپولین کے لقب سے ملقب کیا۔ مگر اس کے جواب میں غازی موصوف نے انہیں لکھا "اگر واقعی تم میری عزت کرنی چاہتے ہو تو مجھے صرف غازی مصطفےٰ کمال پاشا آف ترکی کے نام سے منسوب کرو"۔

یہ عظیم الشان ہستی ۱۲ مارچ ۱۸۸۱ء کو علی رضا کے ہاں پیدا ہوئی والدہ ماجدہ کا نام زبیدہ تھا۔ جو ۸۳ سال کی عمر میں راہئ ملک بقا ہوئیں۔ والدین نے انکا نام مصطفےٰ رکھا۔ علی رضا یورپ کے رہنے والے رومیلی خاندان کے ایک فرد تھے۔ وہ سلونیکا میں محکمہ محصول کی ایک چھوٹی سی اسامی پر ملازم تھے۔ بعد میں انہوں نے استعفاء دیکر تجارت کی جانب رجوع کیا لیکن عمر نے وفا نہ کی زبیدہ دنیا میں اکیلی رہ گئیں۔ بہن بھائی کی تعلیم کی ذمہ داری ان پر تھی۔ مگر اس عالی حوصلہ عورت نے صبر و اطمینان سے کام لیکر انکی اس طرح پرورش کی کہ آج دنیا ان کی حسن تربیت کی داد دینے پر مجبور ہے۔

مصطفےٰ کی عمر صرف پانچ سال کی تھی جب وہ یتیم ہو گئے۔ ان کے چچا نے جو سلونیکا کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ انکی کفالت منظور کر لی۔ وہ اپنے ہاں لے گئے ایک باغ میں جو ان کے چچا کی ملکیت تھا۔ انہیں پھلدار درختوں پر سے جانور اڑا نے کے

لئے مقدر کیا تھا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ قسمت اس ننھے بچے کو مشاق بنا رہی ہے کہ ایک دن اسی طرح اُسے ترکی کی لاش سے...... خونخوار یونانیوں کو ڈرانا ہوگا۔

ان کے والد کا خیال تھا کہ مصطفےٰ کو شروع ہی سے اس طرح تعلیم دی جائے کہ انکی طبیعت ڈاکٹری کی طرف رجوع کرے۔ مگر قانون قدرت کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ انکی نیک جنت نصیب والدہ نے دنیاوی تعلیم شروع کرانے سے پہلے انہیں دینی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ میں جو مسجد سے ملحق تھا۔ داخل کرا دیا۔ جب انکا سن آٹھ سال کا ہوا۔ تو انہیں [illegible] کے ہاں سلونیکا کے ایک مکتب میں داخل کرا دیا۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ترکی جمہوریت کے پہلے صدر کے پہلے استاد نے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ ایسا ہونہار اور ذہین لڑکا اُس نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ تعلیم جاری رہی اور انٹرنس کا امتحان امتیازی خصوصیت کے ساتھ اول درجہ میں پاس کیا اور پھر اپنی والدہ کے علم کے بغیر انہوں نے جونیئر ملٹری کالج کے داخلہ کا امتحان دیا۔ جس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس ہونہار بچے نے اپنی زندگی کی شاہراہ بغیر کسی کے مشورے کے اختیار کی۔ ملٹری کالج میں وہ دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ وہ بہت جلد کالج میں مشہور ہو گئے۔ ان کے حساب کے پروفیسر جو فوج میں کپتان کے عہدے پر سرفراز تھے۔ ان کی نسبت کہا: "انکو ریاضی میں اس قدر دخل ہے کہ دیگر پروفیسر انہیں مصطفےٰ کمال کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور انکی قابلیت پر حیران ہوتے ہیں"۔ پروفیسر مذکور کا خیال تھا کہ یہ شخص دنیا میں کمال حاصل کرے گا۔ اسلئے

اس کا نام مصطفےٰ کمال ہونا چاہیئے۔ اس دن سے وہ مصطفےٰ کمال کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کے شاندار چال چلن کی وجہ سے لڑکے اور پروفیسران کی تعظیم کرتے تھے ان کا سن صرف سترہ سال کا تھا۔ جب وہ کالج میں اسٹوڈنٹ پروفیسر مقرر کر دیئے گئے۔ طالبعلمی کے زمانہ میں جرمن۔ فارسی۔ عربی۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں انہیں خاصی دستگاہ تھی۔ جب انہوں نے والٹیر اور روسو کی کتابیں پڑھیں۔ تو ان کے دل میں قومی درد پیدا ہوا۔ وہ اپنے ہمنام ملک الشعراء قومی شاعر کا کلام پڑھتے ہی چونک اُٹھے۔ ان کے دل میں ویسا ہی قومی جذبہ پیدا ہوا۔ جیسا کہ مشہور جنرل نپلین کو ٹرافالگر کی لڑائی میں ہوا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگے۔ کہ ان کی مادرِ وطن تباہ ہو رہی ہے۔ مگر بحیثیت طالب علم اُنہوں نے کوئی ایسا مظاہرہ نہ کیا۔ جس سے ان کے چال چلن پر کوئی حرف آتا۔ وہ ملٹری کالج کے امتحان میں اوّل رہے۔ اور ان کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انتخاب کر کے جنگی کالج قسطنطنیہ بھیج دیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جب ان کا سن بیس سال کا ہوا تو وہ فوج میں بطور لفٹیننٹ متعین کئے گئے۔ وہاں بھی ان کی جوشیلی طبیعت کو سکون نہ ہوا۔ وہ قومی بربادیوں سے جلتے۔ وہ محسوس کرتے۔ کہ پادشاہ وقت محض روپیہ کی ہوس میں قوم کو برباد کر رہا ہے۔ وہ حکومت کے خلاف تقریریں کرتے۔ اور کہتے "ملک کو بے جا طور پر فروخت کیا جا رہا ہے۔ قوم تباہ ہو رہی ہے۔ رشوت ستانی کا بازار گرم ہے۔ ترک برباد ہو رہے ہیں۔ ہمارا ملک دن بدن کم ہو رہا ہے۔ اور تمام خرابیاں بادشاہ کی وجہ سے ہیں۔ جو بحیثیت خلیفۃ المسلمین باعث تعظیم و تکریم ہیں"

فوج کا کمانڈر جس میں ۔ متعین تھے ۔ ایک بوڑھا تجربہ کار کرنیل تھا ۔ وہ کہتا تھا۔ "یہ نوجوان قومی جذبہ سے سرشار اور شیدائی وطن ہے"۔ وہ ان کی ذہانت اور قابلیت کی داد دیتا۔ اور ہمیشہ ان کی تقریروں کو تجاہل عارفانہ سے نظر انداز کر دیتا ۔ مگر خفیہ پولیس نے پے درپے رپورٹیں کرنا شروع کیں ۔ اور مصطفےٰ کمال ۱۱ر جنوری ۱۹۰۵ء کو گرفتار ہو کر ایک تحقیقاتی کمشن کے روبرو مقام یلدیز پیش کیے گئے۔

انہوں نے کمشن کے روبرو ایسا پُرجوش بیان دیا۔ کہ اہل کمشن ان کی ذہانت ، لیاقت قابلیت اور جذبہ سے اس قدر متاثر ہوئے ۔ کہ ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا ۔ وہ بطور کپتان کے ایک رجمنٹ میں جو دمشق میں تھی متعین کئے گئے ۔ یہ ایک قسم کی جلاوطنی تھی ۔ اور وہ ایسی چالوں کو خوب سمجھتے تھے ۔ وہاں بھی انہوں نے اپنا انقلابی پراپیگنڈا جاری رکھا ۔ ایک انجمن "مادر وطن" کے نام سے قائم کی ۔ انجمن کا مقصد ملک میں حب الوطنی کے خیالات کی اشاعت تھا ۔ اور چند مہینوں کے اندر اندر اس کی شاخیں بیروت ۔ یافا ۔ یروشلم ۔ بصرہ اور بغداد میں قائم ہو گئیں ۔ چونکہ شام سے قسطنطنیہ کا فاصلہ بہت دُور تھا ۔ اس لئے وہ نہائت بیباکی سے اپنے مشن کا پرچار کرنے لگے ۔ ان کو یقین تھا ۔ کہ حکومت عثمانیہ ختم ہو چکی ہے ۔ اور اقتصادی طور پر جان بلب ہے ۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا "سلطنت عثمانیہ سلطان اور خلافت محض بے کار لفظ ہیں"۔

دمشق میں انہیں اور ان کے مشن کو کافی فروغ حاصل ہوا ۔ جب وہ جان چکے ۔ کہ شام میں ان کے قدم اچھی طرح جم گئے ہیں ۔ اور ان کی اشاعت و تبلیغ کا گہرا اثر ہو چکا ہے ۔ تو

انہوں نے جنرل شکری پاشا کی وساطت سے اپنا تبادلہ مقدونیہ کرا لیا۔ جو انقلابی پارٹی کا مرکز تھا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے چھ ماہ کی رخصت لے لی۔ اور پراپیگنڈا کے لیئے عازم مصر ہوئے مصر میں انہوں نے جابجا مرکز قائم کر دیئے۔ اور اس عرصہ میں لوگوں کے دلوں میں وہ آگ لگا دی۔ جو پھر بجھ نہ سکی۔

حکومت کو ان کی سازشوں کا پتہ چل گیا۔ ان کی حراست کا وارنٹ جاری ہوا۔ اور اگر جمال پاشا ان کو گرفتار کر لیتے۔ تو آج ٹرکی کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ برعکس اس کے جمال پاشا نے کمال پاشا کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ تمام حالات سے آگاہ کیا۔ اور کہا۔ کہ میں وارنٹ کی تعمیل میں زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹہ کا توقف کر سکتا ہوں جمال پاشا نے کمال پاشا کو بھاگ جانے کی تمام سہولتیں بہم پہنچا دیں۔ وہ بھیس بدل کر یافہ کی جانب نکل گئے۔ اور وہاں سے اپنے دوست احمد بیگ کی مدد سے گافہ پہنچ گئے۔ وہ ان لق و دق صحراؤں میں ایک عرصہ تک گھومتے رہے۔ حتیٰ کہ عقبہ میں بغاوت برپا ہو گئی۔ اور حکومت نے مجبور ہو کر ان کے عفو کا پروانہ جاری کر دیا۔ ان کا دمشق میں بطور ایجنٹ تعین کیا گیا۔ اب وہ خوب جان چکے تھے۔ کہ ملک کو کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ ان کی کوششیں بارآور ہوئیں جن کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ۱۹۰۸ء میں سلطان المعظم کو معزول کر کے سلونیکا میں نظر بند کیا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب ان کے مدبرانہ تدبر اور سپاہیانہ عقلمندی کی شہرت تمام یورپ میں پھیل چکی تھی۔ اور یورپ کے اکثر اخبارات نے ان پر افتتاحی مقالے لکھے تھے۔ ٹرکی

ہیں وہ مسلمہ طور پر ایک بہت بڑے راہبر خیال کئے جانے لگے۔ وہ جب ٹیلم کاریں سفر کرتے تو لوگوں کو تلقین کرتے۔ وہ کہتے "انسان کی بڑائی اس کی آزادی میں ہے۔ انسان کو چاہیئے۔ کہ کسی کی خوشامد نہ کرے۔ کسی کو دھوکا نہ دے۔ اور کبھی مطلب براری کے لئے مذہب کو آلہ کار نہ بنائے۔" سلطان کی معزولی کے بعد مصطفیٰ کمال نے از سر نو فوج کی طرف توجہ مبذول کی۔ جولیس سیزر کی طرح انہیں اس امر کا احساس تھا۔ کہ وہ صرف فوج کے ذریعہ اپنے مشن کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں انہیں فوجی نمائندے کی حیثیت سے پیرس بھیجا گیا۔ واپسی پر انہیں رائل ملٹری کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ یہ وہ عہدہ تھا۔ جو تمام ٹرکی میں بنظر استحسان دیکھا جاتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں جب اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا۔ تو تمام قوم کی نظریں ان پر لگی ہوئی تھیں۔ اور یہ عام خیال تھا۔ کہ اس بلائے آسمانی سے صرف مصطفیٰ کمال ہی نجات دلا سکتے ہیں۔ مصر غیر جانبدار تھا۔ اس لئے ان کو وہاں سے گزرنے کی اجازت نہ ملی۔ مگر وہ بھیس بدل کر مصر سے نکل گئے۔ مسٹر ایچ۔ ایچ وارتھم اپنی کتاب کمال پاشا میں رقمطراز ہیں۔ کہ "وہ مصر میں پکڑے گئے۔ مگر جب وہ مصری پولیس افسر کے روبرو پیش کئے گئے۔ تو شجاعت۔ دلیری اور دوستی کی بنا پر رہا کر دیئے گئے۔" کمال پاشا نے اٹلی کے مقابلہ میں مردانگی اور شجاعت کے وہ جوہر دکھائے۔ کہ بڑے بڑے تجربہ کار جرنیل انگشت بدندان رہ گئے۔ اٹلی والوں کو کیا معلوم تھا۔ کہ ان کو پے در پے شکستیں ایک ایسے شخص کی وجہ سے ہو رہی ہیں۔ جو آئندہ بیس سال کے اندر دنیا میں یکتا ہو گا۔

ان دنوں وزیر اعظم کا خیال تھا۔ کہ فوج کی ترتیب و تنظیم جرمن افسروں کی زیر نگرانی

کرائی جائے۔ مصطفیٰ کمال کو اس سے قطعی اتفاق نہ تھا۔ وہ کہتے تھے "کہ اس سے بُزدلی اور بے وقوفی ٹپکتی ہے۔ بُزدلی اس لئے کہ ترکوں کو اپنے آدمیوں کی قابلیت پر اعتبار نہیں۔ اور بے وقوفی اس لئے کہ ہماری کمزوریوں اور خامیوں کا پتہ دوسری قوموں کو لگ جائیگا"۔ انہوں نے وزیر اعظم کی تجویز کے خلاف مقالے لکھے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کو دُور دراز علاقہ صوفیہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاکہ ہمیشہ کے لئے ان کے لبوں پر مہر سکوت لگ جائے۔

اُن کی دُوربین نگاہ نے بھانپ لیا۔ کہ وسطی یورپ کی طاقتیں جنگ عظیم کی تیاری میں مصروف ہیں۔

انہوں نے دیکھا۔ کہ جرمنی کا اثر ٹرکی میں بہت زیادہ ہے۔ وہ بیانگ دہل کہتے۔ کہ اگر جرمنی نے جنگ عظیم میں فتح پائی۔ تو وہ ٹرکی کو اپنا خوشہ چین سمجھیگا۔ ٹرکی کی حیثیت غلامانہ ہو گی۔ اگر جرمنی کو شکست ہوئی۔ تو ٹرکی پس جائیگا۔

جو پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

مصطفیٰ کمال نے ہر ممکن کوشش کی کہ ٹرکی اس آگ میں نہ کُودے۔ مگر طوطی کی آواز نقار خانے میں کون سُنتا تھا۔ ان کی کوششیں رائیگان گئیں۔ اور ٹرکی نے بھی اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

اعلان جنگ کے بعد حکومت کی یہ مرضی رہی۔ کہ ان کو میدان کارزار میں نہ بھیجا جائے۔ اس سے ان کا جی کڑھتا۔ وہ محسوس کرتے۔ کہ ملک و ملت کی خدمت نہ کرنے

ہیں وہ ایک گناہ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ انہوں نے تنگ آکر وزیر اعظم کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا "کیا مجھے اس قابل نہیں سمجھا جاتا۔ کہ میں ملک کی آزادی برقرار رکھنے میں حصہ لے سکوں" قسطنطنیہ میں رقابت کا بازار گرم تھا۔ انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ مگر جب ۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو حلیفوں کو شکست فاش ہوئی۔ تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ اس ناخدائے قوم کی ڈوبتی کشتی کے بچانے کے لئے بلایا جائے۔ انہیں ڈویژنل کمانڈر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اس تندہی سے قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو سہارا دیا۔ کہ وہ صاف بچ نکلی۔ سرکاری خطوط میں ان کا تذکرہ ہوا۔ اخبارات نے ان پر افتتاحی مقالے لکھے۔ اتحادی فوجوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ قیصر ولیم نے انہیں مبارک باد کے خطوط لکھے۔ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ اور اتحادیوں کو بھی داد شجاعت دینی پڑی۔

جرمن جرنیل ہانگ کینگ اپنی کتاب "کمال پاشا" میں لکھتے ہیں "اگر کمال پاشا کی قابلیت کا انسان ٹرکی میں ایک اور ہوتا۔ تو میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں۔ کہ ٹرکی کا قبضہ تمام دنیا پر ہو جاتا۔"

جب اتحادیوں نے درہ دانیال پر حملہ کیا۔ تو مصطفیٰ کمال کے سپرد وہاں کی کمان کی گئی۔ گیلی پولی کی تاریخ کے اوراق ان کی فیاضیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور اختصار کے ساتھ بھی بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ دی آنریبل کرنل آبری ہربرٹ کا بیان ہے "ایک دفعہ پچاس ہزار فوج ہسپتال کے جہازوں میں درہ دانیال میں پہنچائی

جا رہا تھا۔ جہازوں پر ہسپتال کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ کہ غنیم جہازوں کو تباہ نہ کرے جہازوں میں کچھ زخمی اور بیمار بھی تھے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت ہسپتال پر گولہ باری کرنا جرم ہے۔ کمال پاشا کے جاسوسوں کو اس کا پتہ چل گیا۔ انہوں نے کمال پاشا کو مطلع کیا۔ مگر اس شریف النفس انسان نے ان کو تباہ نہیں کیا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے۔ تو یہ چشم زدن کا کام تھا۔ انہوں نے لاسلکی کے ذریعہ پیغام بھیجا۔ کہ یہ شرافت نہیں ہے۔ کہ زخمیوں اور بیماروں کی آڑ میں سپاہیوں کو میدان کارزار میں لایا جائے۔ ہم اس جہاز پر گولہ باری کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ جس پر ہسپتال کا پھریرا لہرا رہا ہو۔ اس لئے بہتر ہے۔ کہ ان جہازوں کو واپس لے جاؤ۔"

جنگ کے دوران ہی میں انہیں بہادر اور شریف دشمن کا خطاب دیا گیا کرنل موصوف نے ۱۹۲۱ء میں ہوس آف کامنز میں ان کے متعلق کہا۔ "کمال پاشا کو میں نے بچشم خود ایک سپاہی کی حیثیت میں کام کرتے دیکھا ہے۔ ان کا اخلاق اس قدر اعلیٰ وارفع ہے۔ کہ مجھے وہ ایک ولی معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں سپاہیوں کی تجہیز و تکفین میں مشغول دیکھا۔ ایک معمولی سپاہی کی طرح وہ بذات خود قبریں کھودتے۔ مُردوں کو نہلاتے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے۔ دوائیں پلاتے۔ راتوں جاگتے۔ اور صبح کو بطور کمانیر کے ایسے مشغول ہوتے۔ گویا وہ لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔"

جنرل ٹاؤنشینڈ نے جو کرنل ہربرٹ کے ہمراہ قط العمارہ میں گرفتار ہوئے تھے۔ ان کی تعریف میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں کمال پاشا کی فیاضی۔ شرافت۔ شجاعت اور بہادری کے وہ واقعات بیان کئے ہیں۔ کہ پڑھنے والوں کے منہ سے بے اختیار ان کی تعریف نکل

جاتی ہے۔

۱۶-۱۹۱۶ء میں ٹرکی فوج میں ٹائیفائڈ، طاعون اور قحط اس شدت سے برپا ہوا۔ کہ لوگ وحشت زدہ ہو گئے۔ مگر اس بہادر اور نیک نہاد انسان کے پختہ ارادوں میں تزلزل نہ آیا۔ اور اس ہوشیاری سے کام کیا۔ کہ تین مہینہ کے اندر وبا پر پورا قبضہ پا لیا۔

لڑائی کے دوران میں وہ شہزادہ ولیعہد وحید الدین کے ہمراہ قیصر ولیم سے ملنے کے لئے مغربی محاذ جنگ پر پہنچے۔ وہاں ان کی قیصر اور ہنڈنبرگ اور لوڈن وارف اور دیگر مشہور و معروف جرنیلوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ انہوں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا۔ کہ مصطفیٰ کمال کس دل و دماغ کا انسان ہے۔ کمال نے بغیر خوف و خطر کہہ دیا۔ کہ لڑائی کے متعدد محاذ قائم کرنا سراسر غلطی ہے۔ اور اگر ان سب کو چھوڑ کر صرف ایک محاذ پر زور نہ ڈالا گیا۔ تو انجام بخیر نہ ہو گا مصطفیٰ کمال کا تعارف قیصر ولیم سے کرایا گیا۔ تو انہوں نے از روئے استعجاب دریافت کیا۔ "کیا آپ وہی کمال پاشا ہیں جنہوں نے انفنٹری پر عظیم الشان فتح حاصل کی تھی؟" آپ نے آنکھیں نیچی کر کے فرمایا۔" ہاں میری ہی قسمت میں اس فتح کی سرفرازی لکھی تھی۔"

اثنائے ملاقات میں ہنڈن برگ نے ترکوں کے خلاف شکایت کی۔ کہ وہ ارمنوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔ آپ نے بے باکی سے جواب دیا۔ کہ کیا آپ بھی اس پراپیگنڈے سے متاثر ہو گئے ہیں۔ جو آرمنوں نے ہمارے خلاف کر رکھا ہے۔ انہوں نے واقعات کی اس طور پر تردید کی۔ کہ ہنڈن برگ قائل ہو گئے۔ اور عذر تقصیر چاہا۔ انہوں نے کہا۔" مجھے افسوس ہے۔ کہ غلط واقعات مجھ تک پہنچائے گئے تھے۔"

۱۹۱۸ء میں وہ تمام جنوبی افواج کے سپہ سالار مقرر کئے گئے۔ ان ایام میں انہیں اس قدر کام کرنا پڑتا تھا۔ کہ وہ دن رات میں چار گھنٹے بھی مشکل سے آرام کرتے تھے۔ ۲۰ اگست ۱۹۱۸ء کو انہوں نے لارڈ ایلن بی کو شکست دے کر پھر دمشق پر قبضہ جما لیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔ کہ لڑائی کے ڈھنگ اچھے نہیں ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ حلب سے فوجوں کو واپس بلا لیا جائے۔ اور ایک محاذ پر زور ڈالا جائے۔ مگر اہل بست و کشاد کو ان کی رائے سے اتفاق نہ ہوا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حلب میں کرنل ٹی۔ ای لارنس نے کمال پاشا کو گرفتار کر لیا۔ مگر کرنل لارنس ان کے بہت مداح تھے۔ تمام رات ان کی باتوں میں گزر گئی۔ کرنل لارنس ان کی باتوں میں ایسے محو ہوئے۔ کہ صبح کے وقت مصطفےٰ کمال صاف قید سے نکل کر اپنے لشکر میں جا ملے۔ اور کرنل لارنس کو خبر تک نہ ہوئی۔

آخر وہی ہوا جس کا کمال کو خطرہ تھا حلیفوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔ عارضی صلح پر دستخط کئے گئے۔ مگر کمال پاشا کو پریذیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات پر قطعی اعتبار نہ تھا۔ وہ ان نکات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور سمجھتے۔ کہ ولسن کی آنکھوں میں دھول ڈالی گئی ہے۔ انہوں نے سلطان اعظم کو تار دیا۔ کہ کوئی ایسی شرط نہ مانی جائے۔ جو ترکوں کے لئے باعث تذلیل ہو۔ اگر ان کی بات پر عمل نہ کیا گیا۔ تو وہ اکیلے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ مگر ترکوں کے نام پر حرف نہ آنے دیں گے۔ وہ محسوس کرتے۔ کہ اتحادی ترکوں کو کچلنا چاہتے ہیں۔ اور سب سے بدتر شرائط ترکوں کے لئے پیش کی جائیں گی۔

واقعات نے ثابت کر دیا۔ کہ ان کا اندیشہ بے جا نہیں تھا۔ از روئے شرائط جب انگریزی

فوجوں نے اسکندرونہ پر قبضہ کرنا چاہا۔ تو کمال نے بزور شمشیر مقابلہ کیا۔ اور ان کے وہاں قدم نہ جمنے دیئے۔ ترکی حکومت نے انہیں خط لکھے پیغام بھیجے۔ کہ وہ انگریزی قبضہ کے مزاحم نہ ہوں۔ انگریز وہاں عارضی طور پر تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ قسطنطنیہ اور اناطولیہ میں جہاں کمال پاشا مقیم تھے۔ تاروں کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ وزیر اعظم نے کہا: "تم حکومت کی پالیسی کے خلاف کام کر رہے ہو۔ اس لئے تم باغی ہو۔" مگر مصطفےٰ کمال نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھے تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جہاں کسی قوم نے عارضی قبضہ کر کے ملک کو واپس دے دیا ہو۔ میں مجبور ہوں۔ جب تک میری جان میں جان ہے میں ایک انچ زمین پر کسی کا عارضی قبضہ بھی نہ ہونے دونگا۔"

جب دھمکیوں سے کام نہ نکلا۔ تو منت سماجت کی گئی۔ طمع نفسانی دیا گیا۔ کروڑوں پونڈ پیش کئے گئے۔ مگر اس راستباز انسان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنی ہٹ پر قائم رہا۔

جب اسکندرونہ پر قبضہ نہ ہو سکا۔ تو اتحادی فوجیں موصل پر قبضہ جمانے کے لئے آگے بڑھیں۔ کمال وہاں پہنچے اور کچھ مزاحم ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ موصل صرف ترکوں کے لئے ہے۔ انہوں نے اس مستعدی سے کام کیا۔ کہ وہاں کسی کی ایک نہ چلنے دی۔ وہ کہتے تھے "عارضی شرائط میں کوئی ایسی شرط نہیں جس کی رو سے اتحادی ٹرکی کے علاقوں پر عارضی قبضہ کریں۔ اگر کوئی ایسا معاہدہ ہے۔ تو مجھے دکھایا جائے۔ میں ہر خطرہ کے لئے تیار ہوں۔ میری زندگی قوم کی زندگی ہے۔ یہ زندگی چند روزہ ہے۔ جو میرے پاس بطور امانت ہے۔ میں کبھی اس میں خیانت

نہیں کرونگا"

عزت پاشا اتحادیوں کے زیر اثر تھے۔ اور نام کے ۔ وزیر اعظم ۔ جب ان کی ایک نہ چلی۔ تو مجبوراً انہیں استعفےٰ دینا پڑا۔ توفیق پاشا ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ کمال پاشا موصل کی مضبوطی کے بعد قسطنطنیہ میں آندھی کی طرح پہنچے۔ پارلیمنٹ میں کمال پاشا نے اتحادیوں اور توفیق پاشا کے خلاف وہ تقریریں کیں۔ کہ پارلیمنٹ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ وہ راز افشا کئے۔ لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور ہوئی۔ تاہم وزیر اعظم نے استعفےٰ داخل نہ کیا۔

کمال پاشا نے سلطان المعظم سے بہت کہا سنا۔ ملک کی حالت زار پر آنسو بہائے۔ باب عالی کو واقعات سے آگاہ کیا۔ مگر وہاں سے صاف جواب ملا۔

اٹلی اور فرانس، ترکی کی نعش کے گرد چیلوں اور گدھوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ مسٹر لائیڈ جارج یونان کے حامی تھے۔ اور سمرنا اور تھریس پر یونان کا قبضہ کرانے کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کی جا رہی تھی۔ مگر کسی کو کیا معلوم تھا۔ کہ ع

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ وہ وقت تھا جب کمال پاشا کو ڈاکو اور باغی قرار دے کر ان کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی گئی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا جب ان کی بوڑھی والدہ کو اس کا پتہ چلا۔ وہ اپنے بیٹے کے پاس پہونچی جو قسطنطنیہ سے چند میل کے فاصلے پر مقیم تھے۔ رؤف وہاں موجود تھے۔ بوڑھی عورت جوش سے کانپتی تھی۔ اس نے کمال کو مخاطب کر کے کہا۔ "بیٹا ملک و ملت کے لئے

اگر تمہاری ہزاروں جانیں بھی ہوتیں۔ تو میں بڑے شوق سے نثار کرتی۔ جان جائے مگر ملک سے وصوکا نہ کرنا۔ اس وقت اناطولیہ کو جاؤ۔ ترکوں کو جمع کرو۔ فوجوں کو ترتیب دو۔ اور دنیا کو بتادو۔ کہ ایک ترک بچہ اپنے ملک کی حفاظت کرسکتا ہے۔ اناطولیہ یہاں سے بہت دُور ہے۔ کوئی طاقت وہاں پہنچ کر لڑائی نہیں کرسکتی۔ ہاں اگر تم راستے میں پکڑے گئے۔ تو اپنی جان بہادری سے ملک پر نثار کرنا یاد رکھو میں قیامت کے دن تم سے استفسار کروں گی۔ یاد رکھنا مجھے تاجدار مدینہ سے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ کہ میرے بیٹے نے بزدلی سے جان دی"۔

قسطنطنیہ سے انہوں نے اناطولیہ پہونچنے کا قصد کیا۔ کٹھن منزل، لق و دق صحرا، خاردار جھاڑیوں کا لا متناہی سلسلہ، رات کو سفر کرنا، دن کو چھپے رہنا۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ ہر واقعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ کس دماغ کا شخص تھا کیسے دل گُردے کا مالک تھا۔ ان حالات میں دماغی توازن کا قائم رہنا معجزہ سے کم نہیں۔ مگر بقول موسیو فیری "نہ وہ مصائب سے گھبراتا نہ خوشی سے متاثر ہوتا، نہ تخریب سے ڈرتا۔ نہ خوشامد سے پسیجتا۔ وہ ایک فولاد تھا۔ جو نہ آگ سے پگھلے نہ پانی میں حل ہو"۔

الغرض جب وہ اناطولیہ کے شہر سمسون میں پہونچے۔ تو انہوں نے ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے ٹرکی کے مستقبل کے متعلق کہا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"آزاد ٹرکی جس کی ایک انچ زمین بھی آج کے بعد غیر قوم کے قبضہ میں نہ ہوگی۔ محض ترکوں کے لئے ہے"۔

اتحادیوں کے جنگی بیڑوں کی مدد سے یونانیوں نے سمرنا تھریس اور دیگر ملحقہ علاقہ پر قبضہ

کر لیا۔

اناطولیہ پہونچکر انہوں نے قوم کے دلوں میں وہ روح پھونکی۔ جو احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ رؤف وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ایسی فوج ترتیب دے کر یونانیوں کو شکست فاش دی۔ اور تمام علاقہ ان کے قبضہ سے نکال لیا۔ اس ضمن میں یہ بیان کرنا ضروری ہے۔ کہ لوگ حب الوطنی کے جذبہ سے بے حد سرشار تھے۔ ایک ڈاکو احمد نامی کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ کہ وہ سلطان کے خلاف تھا۔ اور یونانیوں سے جا ملا۔ ایک روز ایک یونانی افسر نے بحالت مدہوشی تمباکو کا بٹوہ احمد کو دیا۔ احمد نے پوچھا۔ کہ یہ بٹوا اُسے کہاں سے ملا۔ نشہ کی ترنگ میں یونانی نے کہا۔ کہ سمرنا میں وہ ایک خوبصورت ترک لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔۔۔ مسلمان لڑکی مجھ سے شادی پر رضامند نہ ہوتی تھی۔ میں نے اس کی زبردستی عصمت دری کی۔ بعد میں اس کو اور اس کی ماں دونوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اور اس کے دوپٹے سے یہ کپڑے کا ٹکڑا کاٹ لایا جس کا بٹوا بنا لیا۔ احمد کا خون کھولنے لگا۔ وہ اُٹھا اور اپنے خنجر سے اس یونانی کو ہلاک کر ڈالا۔ اور ترکی فوجوں سے جا ملا۔ وہاں پہونچکر یونانیوں کے خلاف ایسا لڑا۔ کہ بدنامی کے تمام دھبوں کو دھو ڈالا۔

۱۹۲۰ء میں کمال پاشا نے مجلس مشاورت قائم کی جس میں تمام فدایانِ ملت، جو قسطنطنیہ سے بھاگ کر نکل آئے تھے۔ شامل ہوئے۔ منجملہ ان کے رؤف بے علی فواد پاشا فوزی پاشا، خالدہ خاتون بھی تھے۔ بہت غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے۔ کہ چونکہ قسطنطنیہ میں حکومت اور باب عالی اتحادیوں کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔ اس لئے انگورا میں

عارضی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

بہت تنابیت کے بعد ۵ جولائی ۱۹۱۹ء کو انہوں نے باب عالی کو لکھ بھیجا کہ "آج سے قسطنطنیہ کی حکومت سے اناطولیہ آزاد ہے۔ بلکہ قسطنطنیہ اناطولیہ کے ماتحت ہو گا یا باب عالی پہلے کی طرح خلیفہ تصفیہ ہوں گے۔ ہم بصد ادب و احترام باب عالی سلطان المعظم خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں عرض کرتے ہیں۔ کہ بعض وجوہات کی بنا پر قسطنطنیہ ..... دارالسلطنت نہیں رہ سکتا۔ اس لئے وہ انگورا قیام فرمائیں۔ اور ملک و دولت کی مرضی کے خلاف کسی قسم کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق اتحادیوں سے نہ رکھیں۔" مگر یہ انہیں کیسے منظور ہو سکتا تھا۔ باب عالی سے حکم صادر ہوا۔ کہ جیسے بھی ہو مصطفیٰ کمال کو گرفتار کر کے اتحادیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر وہ اس قسم کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔

وہ انگورا پہنچے۔ ایک دوست کی وساطت سے انہیں بہت سا روپیہ مل گیا جس سے فوجوں کی تنظیم کی۔ شہر پر قبضہ کیا۔ پارلیمنٹ کے لئے ووٹروں کی فہرست بنائی۔ عام انتخاب کیا۔ حکومت کو ہر طرح مستحکم کیا۔ اور لوگوں میں احساس پیدا کر دیا۔ کہ کسی ملک کے لئے سب سے بہتر حکومت اس کی اپنی حکومت ہے۔ الغرض انگورا میں حب الوطنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اتحادیوں اور سلطان کی ریشہ دوانیاں اور غداروں کی ہوسیں کمال پاشا کی پریشانی بڑھانے کے لئے کم نہ تھیں۔ قسطنطنیہ کی حکومت کی دن رات کوشش رہتی کہ کسی طرح مصطفیٰ کمال کو گرفتار کر لیا جائے۔ مگر جس کا نگہبان خدا ہو۔ اُسے کون گزند پہنچا سکتا ہے وہ ملک میں روز بروز زیادہ ہر دلعزیز ہو رہے تھے۔ لوگ ان کے ایثار اور قربانی کو

قدر دانی کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ نوری پاشا نے پارلیمنٹ میں کہا حضرات آپ کو معلوم ہے کہ خداوند تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی تھی۔ کہ اس نے ایسے آڑے وقت میں ہماری قوم کی نجات کے لئے غازی مصطفٰے کمال پاشا کو کھڑا کر دیا۔ ہمارے ملک کے حصے بخرے ہو چکے تھے۔ اتحادیوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ قسطنطنیہ فرانس کے حوالے کیا جائے ترکوں کو یورپ سے نکال دیا جائے۔ مسجد ایا صوفیہ کو گرجا کی صورت میں بدل دیا جائے۔ درہ دانیال کے قلعوں کو مسمار کر دیا جائے۔ سمرنا تھریس اور قسطنطنیہ یونان کے حوالے کر دیا جائے۔ موصل پر انگریزی قبضہ ہو۔ ایشیا سے کہ ہمارے امریکہ کے زیر اثر ہو۔ ان حالات میں ہماری حالت تو غلاموں سے بدتر ہو گی۔ ہمارے بچے قتل کر دیئے جائیں گے۔ ہماری دولت لوٹ لی جائیگی ہماری عورتوں کی حالت بیسواؤں سے بدتر ہو گی۔ ان تمام واقعات کو ثابت کرنے کے لئے میرے پاس دول انگلشیہ، اطالیہ اور فرانس کا عہد نامہ موجود ہے جس کو بوقت ضرورت ہم استعمال کریں گے۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ اس قسم کے طوق سے بچنے کے لئے کسی ایک شخص پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ تقریروں اور بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں۔ کہ کمال پاشا کو ٹرکی کا ڈکٹیٹر بنا دیا جائے۔"

پارلیمنٹ میں کہرام مچ گیا۔ قوم نے متفق الرائے ہو کر ان کو ڈکٹیٹر مقرر کر لیا۔ غازی موصوف نے فرانس کو یہ نوٹ بھیجا۔ "اگر تم...... یا کوئی اور دوسری طاقت ٹرکی کا گلا گھونٹنا چاہتے۔ تو اُسے کم از کم جنگ عظیم جیسی ایک اور جنگ کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے"

مسٹر ہیج۔ اے سنڈر اپنی کتاب "ٹرکی آف ٹوڈے" میں رقمطراز ہیں "ایشیائی لوزان سے

مقابلہ میں بلحاظ، تدبر، شجاعت، دلیری، فیاضی اور شرافت ایک افضل کمتب تھا۔"

اتحادیوں اور ... ان نے سمجھ لیا۔ کہ مصطفےٰ کمال اور ان کی پارٹی کسی طرح بھی کچلی نہیں جاسکتی۔ اس لئے اب ان سے کوئی اور چال چلنی چاہیئے۔ انہوں نے خیال کیا۔ کہ ان کی پارٹی میں حسد کی آگ لگائی جائے۔ مگر انہیں کیا معلوم تھا۔ کہ وہ سب حُبّ الوطنی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اور ان چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جاسوسوں کو جو اس مطلب کے لئے بھیجے گئے تھے۔ گرفتار کرکے حوالات میں بند کر دیا۔

۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں اتحادیوں نے سلطان کی حکومت کو آمادہ کیا۔ کہ وہ نیشنلسٹ گورنمنٹ کا خاتمہ کردیں۔ اس طرف سے سلطان کی فوجیں بڑھیں۔ دوسری طرف سے یونان بڑھا۔ آج اس علاقہ پر قبضہ کیا۔ کل اس پر حتیٰ کہ کمال اور اُن کے رفقاء کس مپرسی کی حالت میں رہ گئے مگر اس آڑے وقت میں بھی اس عظیم الشان شخص نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ نوری پاشا کو سلطان کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ خود یونانیوں کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ اور دونوں کو وہ ناک چنے چبوائے۔ کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔

ان مصائب کے ایام میں وہ اکثر خلفائے راشدین کی تاریخیں پڑھتے۔ لوگوں سے کہتے کہ خلفاء کے نقش قدم پر چلنے سے تمام مصائب دُور ہوسکتے ہیں۔ آج اسلام پر وہی زمانہ طاری ہے۔ جو رسالت مآب کی وفات پر تھا۔ آج وہی حضرت علی اور امیر معاویہ کی لڑائی کا زمانہ ہے۔ پھر انہوں کا دل بڑھانے کے لئے کہتے۔ کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

نہ تو وہ لائڈ جارج کی دھمکیوں کی پروا کرتے۔ نہ کرزن کے خطوط کا ان پر اثر ہوتا۔ نہ موسیو بریاں
کی چکنی چپڑی باتوں پر کان دھرتے۔ وہ کہتے "ایک چھوڑ ہزار معاہدے سلطان اور اس کی حکومت سے
کر لو۔ ملک ترکوں کا ہے۔ صرف انگورا کی حکومت ملک کی نمائندہ حکومت ہے۔ اور جب تک
ہماری جان میں جان ہے۔ کوئی غیر ملکی حکومت ترکی کی ایک انچ زمین پر بھی قابض نہیں ہو
سکتی۔ اس اثنا میں روس اور انگورا کے تعلقات   ہو گئے۔ روس نے کثیر التعداد سامان حرب
انگورا بھیجا۔ تاکہ وہ اس کی مدد سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔

اتحادیوں نے آخری چال پھر چلی۔ یونانیوں نے سمرنا پر حملہ کیا۔ ان کی جمعیت پانچ لاکھ سے
زیادہ تھی۔ کمال پاشا بنفس نفیس اس مہم کے سپہ سالار تھے۔ ایک عرصہ تک لڑائیاں ہوتی رہیں
مگر آخری رات کمال درد گردہ سے سخت لاچار ہو گئے۔ اس حالت میں بھی ٹیلیفون ہاتھ میں تھا۔
سرداروں کو ٹیلیفون کے ذریعہ ہدایات دیتے۔ درد اس قسم کا تھا۔ کہ ان کے معالج ان کی زندگی
سے مایوس ہو گئے تھے۔ مگر صبح کے وقت یونانی فوجیں بھاگ نکلیں۔ ڈیڑھ لاکھ کے قریب فوجی
پکڑے گئے۔ اور یونانیوں کو اس قسم کی شکست ہوئی۔ کہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جب
کمال پاشا کو اس کی خبر دی گئی۔ تو وہ بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو گئے۔ اور حیرانی کی بات ہے
کہ ان کا درد آناً فاناً جاتا رہا۔

فتح کی خوشی میں قوم نے متفق ہو کر ان کی خدمت میں غازی کا خطاب پیش کیا جسے انہوں
نے نہایت فخر کے ساتھ قبول کیا۔ جب کوئی چال نہ چل سکی۔ تو فرانس نے ۱۹۲۱ء میں موسیو
فرنگلن بلاں کو انگورا بھیجا۔ تاکہ وہ ترکوں سے معاہدہ کریں۔ فرانس نے ترکی جمہوریت کو تسلیم کیا۔

اور اقرار کیا۔ کہ فرانس ہر حالت میں ٹرکی کا حلیف ہو گا۔ اس سے قبل روس کا معاہدہ ترکوں سے ہو چکا تھا۔ فرانس کے معاہدہ کے بعد اٹلی نے بھی جمہوریت کو قبول کر لیا۔ اور اس امر کی امکانی کوشش کی۔ کہ ان کا علاقہ برقرار رہے۔ اور ان سے کوئی تاوان نہ لیا جائے۔

سوائے انگلستان کے دیگر طاقتوں نے یکے بعد دیگرے ان سے معاہدے کیلئے۔ اور ٹرکی کے یہ معاہدہ درسائی میں وہ شرائط پیش ہوئیں۔ کہ کسی شکست خوردہ غنیم کو میسر نہ ہوئی تھیں۔

لڑائی سے قبل اگر کوئی غیر ملکی شخص ٹرکی میں کسی جرم کا ارتکاب کرتا۔ تو اس پر مقدمہ چلایا جاتا۔ از روئے معاہدہ اس کی سماعت اس کی اپنی حکومت کرتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مجرم بری ہو جاتا۔ مگر پولیٹیکل جرائم بہت زیادہ ہوتے۔ اس معاہدے کو کیپٹیلیشن کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ کمال پاشا نے سب سے پہلے جو کام کیا۔ وہ یہ تھا کہ اس کو منسوخ کرایا۔

جب مصطفےٰ کمال کو ذرا فراغت ملی۔ تو ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں انہوں نے فوج کی تنظیم کی۔ ملک میں فوجی ایکٹ پاس کرایا۔ سامان حرب بنانے کے کارخانوں کی بنیاد انگورا میں ڈالی تین ملٹری کالج قائم کئے۔ ان میں ہر ترک کو آٹھ سے اٹھارہ سال تک جبری تعلیم دی جاتی۔ جدید طریقے پر فوجوں کو رسالوں۔ رجمنٹوں۔ توپ خانوں اور کمپنیوں میں تقسیم کیا۔ ملٹری اور سول پولیس قائم کی۔ ہوائی جہازوں کے بنانے کے لئے ملک میں کارخانے قائم کئے۔

فورڈ کمپنی کو ۲۵ سال تک ٹرکی میں تجارت کرنے کی اجازت دی محصول معاف کر دیا۔ کارخانوں کے لئے حکومت کی طرف سے اس کو مفت اراضی دی گئی۔ اس کے عوض کمپنی کے

لئے ان شرائط کا پابند رہنا لازمی ٹھہرا۔ کہ وہ سربراہ حکومت کو ایک ہوائی جہاز مفت دے۔ کوئی آدمی سوائے ترکوں کے ملازم نہ رکھے۔ اور میعاد مقررہ کے اختتام پر تمام کارخانے حکومت کے حوالے کردے۔ علاوہ بریں پانچ کارخانے نہایت وسیع پیمانے پر ہوائی جہاز بنانے کے لئے حکومت نے قائم کئے جن میں فرانسیسی اور ترکی انجینئر ترکوں کے بچوں کو جہاز بنانے کا کام سکھاتے ہیں۔

تین کارخانے بحری جہاز بنانے کے لئے بنائے گئے۔ ملک میں ریل ٹیلیفون تلگراف اور وائرلیس کا جال بچھا دیا۔ قانون بنا دیا کہ کوئی ترک بدیشی شے نہیں خرید سکتا۔ اگر خریدے گا تو اتنی ہی قیمت حکومت کے خزانے میں داخل کرنی پڑے گی۔ کپڑا بننے کے لئے روس سے، مشینیں منگائیں چینی اور تانبے کے برتن بنانے کے لئے جاپان سے کاریگر بلائے۔ ریشمی کپڑے بنانے کے لئے چینی اہل حرفت کو دعوت دی۔ دیا سلائی بنانے کے لئے سویڈن سے ماہرین طلب کئے۔ الغرض آج کوئی ایسی چیز نہیں جو ملک کے اندر تیار نہ ہوتی ہو۔

ملک میں تعلیم کے لئے تین دارالعلوم آکسفورڈ اور کیمبرج کے طریقے پر قائم ہیں۔ پانچویں درجے تک تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ سفری اسکول اس لئے بنائے گئے ہیں۔ کہ کوئی شخص علم سے بے بہرہ نہ رہ سکے۔ انجینئرنگ۔ قانون طب کے علیحدہ علیحدہ کالج ہیں۔ اور لطف یہ کہ ان تمام شعبوں میں تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی جاتی ہے۔ یہ قرار دیا گیا ہے۔ کہ ملک کی زبان ترکی ہے۔ اور کوئی ترک سوائے ترکی زبان کے کسی دوسری زبان میں گفتگو نہ کرنے پائے۔

پولیس کا کالج علیحدہ بنایا گیا ہے بقول سر ریٹن "آج ٹرکی پولیس دنیا کی بہترین پولیس ہے۔ اور وہ لندن کی پولیس سے بھی گوئے سبقت لے گئی ہے۔" ایک دفعہ مصطفیٰ کمال ایک سوداگر کے بھیس میں تھے۔ ایک سپاہی کو جس کی تنخواہ صرف تئیس روپیہ تھی۔ آپ نے آزمائش کے طور پر سو پونڈ کا ایک نوٹ دیا۔ تاکہ وہ انہیں اس راستہ سے گزر جانے دے۔ جو حکومت نے مسدود کر رکھا تھا۔ مگر اس بہادر سپاہی نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ وہ اپنی جان دے دیگا۔ مگر رشوت لے کر ملک سے دغا نہیں کرے گا۔

مصطفیٰ کمال نے زراعت کے لئے کارخانے اور فارم قائم کئے۔ سائنٹفک زراعت کو ترقی دینے کے لئے بیش بہا انعام مقرر کئے۔ لوگوں کو محض دس روپیہ ملکی خزانہ میں داخل کرنے کے عوض تین سو روپیہ کی مشینری مل جاتی ہے جس کی قیمت پانچ سال میں وہ قسطوں میں ادا کرتے رہتے ہیں۔ جو لوگ مشینری کے ذریعہ کھیتی باڑی کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے آبیانہ میں ایک نمایاں تخفیف کر دی جاتی ہے۔

ترکوں کو ایک قوم بنانے کے لئے اصول وضع کئے۔ تجارت کھیتی باڑی اور دفتروں کے اوقات کی تقسیم کی۔ کوئی دکاندار دس بجے سے پیشتر دکان نہیں کھول سکتا۔ اور ۶ بجے شام کے بعد کھلی نہیں رکھ سکتا۔ لوگوں کے لئے ایک لباس مقرر ہے۔ الغرض اس محب قوم نے وہ قاعدے اور طریقے قائم کر رکھے ہیں۔ کہ سننے اور دیکھنے والا متحیر رہ جاتا ہے۔

مذہب کا مفہوم انہوں نے خوب سمجھ لیا ہے۔ کوئی شخص بغیر ڈگری حاصل کئے نہ طلاق دے سکتا ہے۔ نہ ایک سے زیادہ شادی کر سکتا ہے۔ مرد اور عورت کو یکساں حقوق حاصل

ہیں۔

تمام یورپ میں ٹرکی ہی پہلا ملک ہے۔ جہاں عورت کو مکمل آزادی دی گئی ہے۔ خالدہ ادیب خانم ہی پہلی عورت تھیں۔ جو وزیر کابینہ مقرر ہوئیں۔ مسجدوں میں نماز کے اوقات مقرر ہیں۔ کوئی پیر لائسنس حاصل کئے بغیر مرید نہیں بنا سکتا۔ کوئی واعظ جب تک اس نے باقاعدہ ٹریننگ حاصل نہ کی ہو۔ وعظ نہیں کر سکتا۔ ہر مسجد کے ساتھ کلب اور مکتب ملحق ہیں۔ قرآن کے مستند ترجمہ کے لئے پارلیمنٹ کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس کے زیر نگرانی ترجمہ کرایا جاتا ہے۔

ملک میں قومی بنک کا افتتاح کیا گیا ہے۔ ہر ترک مرد اور عورت کو ایک نہایت قلیل منافع پر قرض مل سکتا ہے۔ اگر کوئی ترک کسی دیگر سلطنت کے بنک سے روپیہ بطور قرض لے تو اُسے وہی سود حکومت کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ اس امر کو چھپائے۔ اور اس کا اظہار نہ کرے تو اس کی تمام جائداد ضبط ہو سکتی ہے۔

جب اس مایۂ ناز انسان کو ہر طرف سے اطمینان ہو گیا۔ تو اس نے سمرنا کے ایک کروڑ پتی کی صاحبزادی لطیفہ خانم سے عقد کر لیا۔ مگر تین سال کی رفاقت کے بعد انہیں طلاق دینی پڑی طلاق کی اصلی وجہ آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔ مگر مسٹر وارتھم کا خیال ہے کہ لطیفہ خانم انہیں مجبور کرتی تھیں۔ کہ وہ خود بادشاہ بن جائیں۔ اس طرح ان میں اختلاف کی خلیج دن بدن وسیع ہوتی گئی۔ اس کے بھائی بھی حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کرنے لگے مگر مصطفےٰ کمال کو یہ بات قطعی طور پر ناپسند تھی۔ بادشاہت کو وہ نفرت سے دیکھتے۔ اور اس کا قبول کرنا

گناہ عظیم سمجھتے۔ ملک نے انہیں مجبور کیا۔ کہ وہ جمہوریت کے لائف پریذیڈنٹ ہو جائیں۔ مگر انہیں یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور جواب میں کہا۔ جب تک میں نیک نیتی سے کام کرتا ہوں۔ ہر پانچسال کے بعد مجھے انتخاب کیا جائے۔ اور اگر میری نیت میں خلل معلوم ہو۔ تو ملک و ملت کا فرض ہے۔ کہ مجھے ایک ذلیل انسان کی طرح ٹھوکریں مار کر ملک سے نکال دے۔"

وہ جانتے تھے۔ کہ ملک کی بقا اسی میں ہے۔ کہ یونانیوں اور آرمینوں کو ملک سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے وہ علاقے جن میں یونانی اور آرمنی مقیم تھے۔ یونان سے بدل لئے۔ اور ان کے عوض یونان سے وہ علاقے لے لئے۔ جن میں ترک آباد تھے۔

انگورا کو یورپین شہروں کی طرح از سر نو تعمیر کرایا۔ غربا کو حکومت کی طرف سے مفت مکان تعمیر کرا کر دیئے گئے۔ شہر کے وسط میں ایک عجیب و غریب مصنوعی جھیل بنائی۔ جو ایک دلفریب منظر پیش کرتی ہے۔ ملک کا قومی بینک، جمہوریت کے دفاتر، یونیورسٹی کی عمارتیں۔ عجائب گھر۔ مساجد، سینما گھر، تھیٹر ہال، کچہری، ہائیکورٹ، ہسپتال، ہوٹل، دیگر سینکڑوں عمارتوں کے علاوہ چند ایسی سر بفلک عمارتیں ہیں۔ جن کو دیکھ کر دل میں عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شفاف نہریں اور صاف ستھری سڑکیں ہر جانب بل کھا رہی ہیں۔

۱۹۳۲ء میں کانگرس کے موقعہ پر وہ ایک ہفتہ تک تقریر کرتے رہے۔ زار زار روتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "اگر ملک نے محض اس مصطفیٰ کمال کی قدردانی کرنی سیکھی ہے جو گوشت اور ہڈیوں کا بنا ہوا ہے۔ تو وہ بہت جلد تم میں سے غائب ہو جائیگا۔ لیکن اگر تم میں سے ہر ایک مصطفیٰ کمال ہو گیا۔ تو یقیناً تم نے اس کی بہت زیادہ قدر کی۔"

مصطفیٰ کمال پاشا

وہ ایک زبردست اہل قلم ہیں - اور آج کل سیرت نبوی لکھنے میں مصروف ہیں - ان کا خیال ہے - کہ آج تک ترکی زبان میں کوئی عمدہ سیرت نہیں لکھی گئی -

الغرض اس عجیب و غریب انسان نے ۱۴ سال کے عرصہ میں تمام ترکی کی کایا پلٹ دی ہے - اور آج ٹرکی یورپ ہی کی نہیں - بلکہ دنیا کی ایک مضبوط سلطنت تصور ہوتی ہے - حکومتیں اس سے معاہدہ کرنا فخر سمجھتی ہیں - اور سچ تو یہ ہے - کہ یہ صرف غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی بدولت ہے - جو نہایت بے سروسامانی کی حالت میں آدھی رات کے وقت گھر سے اس شعر کا مصداق بن کر نکلے تھے - کہ ؎

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

کرنل طامس ایڈورڈ لارنس

دُنیا کے رجالِ عظیم کی زندگیاں ایک راز ہوتی ہیں۔ اور جو کارہائے نمایاں اُن کی غیر معمولی قابلیت کی بدولت معرضِ شہود میں آتے ہیں۔ دیگر اہلِ جہاں کے لئے بادی النظر ہی میں نہیں۔ بلکہ حقیقت میں عقدہ ہائے لاینحل کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کی شخصیتوں میں سے ایک کرنل لارنس کی شخصیت بھی ہے۔ حسن بن صباح کے زمانہ سے جس کو آج سات آٹھ سو سال کے قریب ہوتے ہیں۔ غازی انور پاشا مرحوم و مغفور کو چھوڑ کر درمیانی عرصہ میں ایسی کوئی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس نے ابرو کے ایک اشارے سے مختلف ممالک میں انقلاب عظیم برپا کر دیا ہو۔ اور جو حکومتوں کے نظم و نسق کے شیرازہ کو درہم برہم کرنے میں اس قدر موثر ذریعہ ثابت ہوا ہو۔ کرنل لارنس کے اندر یہ ایک خداداد ملکہ ہے۔ کہ جس جگہ وہ اپنی ریشہ دوانیوں کا جال پھیلانا چاہتا ہے۔ قدرتی حالات خود اس کی مساعدت کرتے ہیں۔ جب سے دُنیا کرنل لارنس کے نام سے آشنا ہوئی ہے جہاں کہیں انقلابی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور کسی ایسے شخص کو اس کا محرک گردانا جاتا ہے۔ تو لوگ فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ کرنل لارنس کے سوا اس انقلاب کا محرک کوئی اور شخص نہیں ہے۔ اگر آج اُسے ایران میں دیکھا گیا۔ تو کل افغانستان کے پہاڑی علاقہ میں اس کی خبر ملی۔ پرسوں کراچی کی بندرگاہ پر اُسے شناخت کیا گیا۔ اور چوتھے دن اطلاع ملی۔ کہ اس



مشاہیر عالم از حمید، اے

قسم کا ایک شخص لنکا میں وارد ہوا ہے۔ کبھی اُسے لق و دق صحراؤں کو ناپتے دیکھا گیا۔ اور کبھی دُنیا کے مشہور ترین ادیب مسٹر جارج برنارڈ شا کے ڈرائنگ روم میں دلچسپ مذاکرات میں ہمہ تن مصروف پایا گیا۔

یہ دیکھ کر کرنل لارنس کو اس وقت دنیا میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ جو لوگ اس محیر العقول انسان کے حالات سے ناواقف ہیں۔ اور جن کو کم و بیش معلومات ہیں ان کے سامنے اس مقالے میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس کی شخصیت کو بے نقاب کیا جائے۔ ایک وسیع مطالعہ کے بعد ہم نے ان حالات کو فراہم کیا ہے۔

لارنس کا آبائی وطن گالوے ہے۔ یہ مقام آئرلینڈ کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اہل گالوے دُنیا کی قوموں میں سب سے زیادہ محنتی اور جفاکش ہیں۔ اگرچہ انہیں آئرلینڈ سے قربت حاصل ہے۔ مگر ان کی رگوں میں اسکاچ۔ ویلش، انگریزی اور ہسپانوی خون کی تخلیط ہے۔ ساڑھے سات سو سال کا عرصہ ہوا۔ کہ اس کے جد اعلیٰ میں سے ایک شخص رابرٹ لارنس نے شاہ رچرڈ شیر دل کے ہمراہ صلیبی محاربات میں وہ نمایاں کام کئے۔ کہ تاریخ میں اس کا نام نہایت عزت سے لیا جاتا ہے۔ قابل باپ کا قابل سپوت ایک مشہور ضرب المثل ہے۔ جو کام شاہ رچرڈ، اور کرنل لارنس کے جد امجد سے نہ ہو سکا۔ نوجوان لارنس نے یروشلم اور بیت المقدس میں کر دکھایا۔ سر ہنری لارنس اور سر جان لارنس جن کا شمار ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی داغ بیل ڈالنے والوں کی صف اولیں میں ہوتا ہے۔ اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

لارنس کے والد ٹامس لارنس ایک بہت بڑے جاگیردار تھے۔ لارڈ گلیڈ سٹون کے زمانہ میں

ان کی حالت ابتر ہونا شروع ہوئی۔ اس لئے وہ اپنی اصلی سکونت ترک کرکے ویلز میں جا مقیم ہوئے۔ کرنل لارنس کو رنون میں پیدا ہوا۔ جو سٹر لائیڈ جارج کا گاؤں ہے۔ لارنس کی زندگی کے ابتدائی پانچ سال جزیرہ جرسی میں گزرے۔ جب وہ دس سال کے ہوئے تو ان کے والد نقل مکان کر کے اسکاٹ لینڈ میں جا بسے۔ تین سال کے مسلسل قیام کے بعد ان کا جی یہاں سے اچاٹ ہو گیا اور وہ جانب فرانس روانہ ہو گئے۔ فرانس میں لارنس کو بہوویاں کے ایک کالج میں داخل کرایا گیا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد سب لوگ آکسفورڈ جا پہنچے۔ درحقیقت لارنس کی ابتدائی تعلیم یہاں شروع ہوئی۔ اس کا ایک ہم مکتب اس کی بابت رقمطراز ہے "اگرچہ وہ اعلیٰ درجہ کے کسرتی نہیں تھے۔ مگر بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ ٹرلمس کی ایک ندی جو آکسفورڈ میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ وہ دن کا بیشتر حصہ اس میں کشتی رانی کرتے رہتے۔ انہیں شروع ہی سے درختوں پر اُترنے چڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بلند و بالا مکانات کی چھتوں پر بلا جھجک چڑھ جاتے۔ ایک دفعہ وہ ایک اونچے مکان کی چھت سے کود پڑے۔ اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی"۔

ان کی زندگی شروع ہی سے بے ربطی عنوان کا مظہر تھی۔ وہ آکسفورڈ کے تعلیمی لیکچروں میں بہت کم شامل ہوتے۔ ایک دفعہ ان کے معمر پروفیسر نے بگڑ کر کہا "نوجوان لڑکے کیا تمہیں، اپنی حالت پر رحم نہیں آتا۔ تم دن رات کھیل کود میں مصروف رہتے ہو۔ یہ حصول علم کا زمانہ ہے بہتر ہو۔ اگر تم اس موقعہ کو غنیمت جان کر فائدہ اٹھاؤ"۔

پروفیسر موصوف کی اس نصیحت سے متاثر ہو کر لارنس نے تحصیل علم کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اور تین سال کے اندر بی۔ اے کی ڈگری امتیازی خصوصیت سے حاصل کر لی۔

بی۔اے میں ان کے موضوع خصوصی کا عنوان "صلیبی جنگیں اور ان کا فن تعمیرات" تھا۔ دار العوام سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے والدین کو مجبور کیا۔ کہ انہیں مشرق ادنےٰ میں مضمون کے متعلق مزید تحقیقات کے لئے بھیجیں۔ اس معاملہ میں ان کے پروفیسر ڈاکٹر ھاوڈ ہاگرتھ نے اُن کے والدین کو کہہ سُن کر اس امر پر رضامند کر لیا۔ اُن کی والدہ کو اندیشہ تھا کہ لارنس خدانخواستہ کسی خطرہ میں نہ پڑ جائیں مگر جب وہ بے حد مصر ہوئے تو انہیں دو سو پونڈ سفر خرچ دیکر روانہ کیا گیا۔ ان کے والدین کو یقین تھا کہ لارنس چند ہفتے بعد واپس آجائیں گے۔ مگر جب تک کا قافلہ جس کے ہمراہ وہ عازم سفر ہوئے تھے۔ واپس آگیا۔ اور وہ واپس نہ آئے۔ تو اُن کے والدین کو سخت مایوسی ہوئی۔

لارنس بیروت سے شام پہونچے۔ وہاں انہوں نے تبدیل لباس کیا۔ عربوں کے ملبوسات میں وہ ایک عرصہ تک بالکل برہنہ پا صحرائے لق و دق میں گھومتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے عراق عرب اور وادیٔ نیل کے درمیانی علاقہ کے باشندوں کی زبان اور اُن کے رسم و رواج سے پوری پوری واقفیت حاصل کر لی۔ دو سال ادھر رہنے کے بعد جب وہ انگلستان واپس پہونچے۔ تو ان کے پاس ایک سو پونڈ باقی تھے۔ انہوں نے اپنا مضمون دار العلوم میں پیش کیا۔ جسے بنظر استحسان دیکھا گیا۔

لارنس کے چار بھائی اور تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سب سے بڑے میجر ھلیگو لارنس فوج میں ڈاکٹر تھے۔ دوسرے ولیم جو ہائی اسکول میں ماسٹر تھے۔ تیسرے فرینک جو مشرق ادنیٰ میں عرصہ دراز تک بادیہ پیمائی کرتے رہے۔ چوتھے آرنلڈ جو آکسفورڈ میں تعلیم پاتے تھے۔ فرینک اور آرنلڈ دونوں جنگ عظیم میں کام آئے۔ میجر ھلیگو جنگ عظیم کے اختتام پر مستعفی

بھی گئے۔ اور چین میں اب بھی بطور مشنری ایک ہسپتال میں کام کرتے ہیں۔ جنگ عظیم سے قبل ایک مشن آثار قدیمہ کے تحفظ کے لئے ملک شام کو روانہ ہوا۔ یہ مشن ڈاکٹر ہاگرتھ کی سرکردگی میں تھا۔ اس میں لارنس نے بھی شرکت کی تھی۔ اس مشن کو اپنے مقصد میں بہت کامیابی ہوئی اور آج آکسفورڈ کے دارالعلوم کے عجائب گھر میں پانچ ہزار قبل مسیح تک کی عجوبہ روزگار اشیاء موجود ہیں۔ یہ چیزیں لارنس نے اس وقت پیش کی تھیں۔ جب لارنس کی عمر صرف تئیس سال کی تھی۔

میجر ینگ جو مشرق اوسط کی خفیہ کور کے افسر اعلیٰ تھے۔ لکھتے ہیں جو جنگ عظیم سے قبل مجھے لارنس سے عراق عرب میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ ۱۹۱۲ء کی کانفرنس میں شرکت کیلئے آئے تھے۔ اس کانفرنس میں انگلستان، جرمنی، روس، فرانس اور ٹرکی جملہ ممالک کے مندوبین مدعو تھے۔ بڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ امر متفقہ طور پر طے پایا۔ کہ اسکندرونہ پر جرمن اقتدار قائم کیا جائے۔ اور جرمنی کو برلن سے بغداد تک ریلوے لائن بنانے کی اجازت دی جائے۔ لارنس اس پر بہت سٹپٹائے اور لارڈ کچنر کے پاس قاہرہ پہنچے۔ انہوں نے لارڈ کچنر سے اس مسئلہ کی بابت استصواب کیا اور بتایا۔ کہ الیگزینڈریٹا پر جرمن اقتدار کا قیام دوسرے لفظوں میں ڈزرائیلی کی ہدایات کی مخالفت ہے۔ جنہوں نے یہ کہا تھا۔ کہ ایشیا میں قیام امن کے لئے ضروری ہے۔ کہ اسکندرونہ پر جرمنی کا قبضہ نہ ہو۔ لارنس نے کہا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسا کرنے سے انگریز دنیا میں ایک جنگ عظیم بپا کرنا چاہتے ہیں لارڈ کچنر نے جواب میں کہا۔ "اے نوجوان میں تمام توانائی امور کی گتھیاں سلجھانے میں صرف کر چکا ہوں لیکن دفتر خارجہ میں میری شنوائی نہیں ہوتی۔ اور ہم دونوں کسی طرح بھی جنگ عظیم کو معرض التوا میں نہیں ڈال سکتے جرمن ان ایام میں بحیرہ بالٹک سے لیکر خلیج فارس تک اپنی ساکھ قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ جرمن انجینئر نہایت تیزی سے برلن بغداد ریلوے کی تعمیر کر رہے تھے۔

لارنس کی طبیعت میں بڑی تیزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک دن انہیں بڑی دور کی سوجھی
پانی کے خالی ٹل خچروں پر لدوا کر ان کو اوپر سے ڈھانک دیا۔ اور خچروں کو ہنکوا کر ایک پہاڑی
پر لے گئے۔ وہاں وہ ٹل زمین میں گاڑ دیئے اور اوپر سے ان کو کسی چیز سے ڈھانک دیا جب
جرمن انجنیئروں نے اپنی دوربینوں سے دیکھا۔ تو انہیں مشین گنیں معلوم ہوئیں۔ انہوں نے
فوراً قسطنطنیہ اور برلن تار دیئے۔ کہ انگریز لڑائی کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اور پہاڑی کو
مستحکم کر رہے ہیں۔

سب سے پہلی مہم جو مشرق اوسط میں گورنمنٹ کے خرچ پر روانہ کی گئی۔ اس میں پروفیسر
وولی اور لارنس نے بھی شرکت کی۔ دونوں نے امکانی کوشش کی کہ بنی اسرائیل کا کھوج
صحرا میں لگایا جائے۔ بڑی دقتوں کے بعد انجیل کے مقدس مقام قادس برانا کا پتہ چلایا۔
یہ وہ مقام ہے۔ جہاں سے حضرت موسیٰؑ پہاڑ سے پانی لائے تھے۔

قادس سے پانچ میل کے فاصلہ پر لارنس اور وولی نے متعدد چشموں کو دریافت کیا
جن کی بابت بیان کیا جاتا ہے۔ کہ جب حضرت موسیٰؑ سے بنی اسرائیل نے شدت پیاس
کا اظہار کیا۔ تو حضرت موسیٰؑ نے ان چشموں کا پتہ چلایا تھا۔

لارنس اور وولی دونوں نے ملکر ایک کتاب "وائلڈرنس آف سن" کے نام سے لکھی ہے
جس میں انہوں نے تین ہزار قبل مسیح کے واقعات پر روشنی ڈال کر تمام دنیا کو رہین منت کیا
ہے۔ وولی کی دوسری کتاب "ڈیڈ ٹاؤن اینڈ لانگ مین" کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ وہ لکھتے
ہیں "لارنس اہل عرب میں نہایت ہر دلعزیز تھے۔ ایک دن ہمارا ملازم احمد شہر سے خرید و

فروخت کر کے واپس آرہا تھا۔ راستے میں وہ مقام پڑتا تھا جہاں جرمن انجینئر ریلوے لائن بنانے میں مصروف تھے۔ احمد نے اپنی مزدوری کی بقایا رقم جرمن انجینئر سے طلب کی جس پر انجینئر بہت بگڑا اور احمد کو بید لگانے کا حکم دیا۔ احمد نے گھر پہنچ کر تمام قصہ لارنس کو سنایا۔ اُن کا خون کھولنے لگے۔ لارنس اسی وقت احمد کو لیکر جرمن کیمپ میں پہنچے اور جرمن کرنیل سے جو ریلوے لائن کا انچارج تھا تمام قصہ بیان کیا۔ کرنیل موصوف نے بگڑ کر کہا۔ کہ میں معزز انجینئر سے ایک معمولی قلی کی بابت کیسے باز پرس کر سکتا ہوں۔ لارنس نے کہا کہ اگر ایک انسان کو تم اسقدر افضل سمجھتے ہو تو یاد رکھو آج شام سے قبل میں تمہارے انجینئر کو پٹوا دوں گا۔ اُن میں تکرار یہاں تک بڑھی کہ جرمن انجینئر نہایت انکسار کے ساتھ احمد سے معافی کا خواستگار ہوا۔

ایک سال تک لارنس صحراؤں میں گھومتے رہے۔ وہ عربی لباس پہنتے تھے۔ اور عربی زبان پر اس قدر قادر ہو گئے۔ کہ اُن کا لب و لہجہ و تلفظ بالکل عرب کا سا ہو گیا تھا۔ انکی فصاحت اور بلاغت کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ جب وہ باتیں کرتے ہیں۔ تو اُن کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔

لارنس کا خیال تھا۔ کہ جنگ عظیم کی چنگاری عنقریب سلگنے والی ہے۔ اُن کا خیال درست نکلا۔ اور اس آگ کے دھوئیں نے تمام دنیا کو گھیر لیا۔ جونہی لڑائی شروع ہوئی وہ قاہرہ میں "کچنر باب" میں بطور سپاہی بھرتی ہونے کے لئے پیش ہوئے۔ جب طبی معائنے کے لئے پیش کیا گیا۔ تو طبی حکام اس لاغر شخص کو جس کا قد ۵ فٹ ۲ انچ تھا۔ دیکھ کر ہنت

ہنسے اور ازراہِ استحقار کہا۔ "لڑکے اپنی ماں کے پاس بھاگ جاؤ۔ اور آئندہ کی لڑائی سے منتظر رہو۔"

انہیں کیا معلوم تھا۔ کہ اسوقت سے چار سال بعد یہ نحیف الجثہ کمزور اور لاغر انسان عرب میں ایک انقلاب برپا کر دے گا۔ دمشق میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوگا۔ اور "نائٹ ہڈ" اور "وکٹوریہ کراس" ایسے معزز خطابات لینے سے انکار کر دے گا۔

جب لارنس بھرتی سے ناامید ہوگیا۔ تو آثار قدیمہ کی جستجو میں پھر مشغول ہوگیا۔ اور ہزارہا سال کی پرانی تہذیب کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔ جب سر گلبرٹ کلیٹن نے معزز اسکالر جارکس سائیکس، آبری ہربرٹ، کارلواس اور نیوکم کو قاہرہ میں مدعو کیا تو لارنس کو بھی خاص طور پر بلایا گیا۔

اگرچہ لارنس کا سن اسوقت صرف ستائیس سال کا تھا۔ مگر وہ ٹرکی شام بیت المقدس عرب ایران اور عراق عرب کے کوائف و حالات سے کماحقہٗ واقف تھے۔ وہ حلب موصل بغداد و بیروت یروشلم اور دمشق کے شریف گھرانوں کو خوب جانتے تھے۔ عربی زبان میں انہیں یہاں تک دخل تھا۔ کہ مشہور و معروف مستشرقین ان پر رشک کرتے۔ وہ متعدد ملکوں کے رسم و رواج سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

جب لڑائی کا زور بڑھا تو انہیں بلاکر محکمہ نقشہ کشی میں متعین کیا گیا۔ اس محکمے میں بڑے بڑے پختہ کار جرنیلوں کا دماغ بھی چکرا جاتا تھا۔ لیکن لارنس اہم سے اہم معاملات کو اس سہولیت سے حل کر کے رکھ دیتے کہ سب جرنیل انگشت بدنداں رہ جاتے۔ لارنس

اہم مقامات پر پہنچنے کے آسان سہل اور مختصر راستے بتاتے اور حملہ کرنے کے ایسے راز ظاہر کرتے کہ انسانی عقل متحیر رہ جاتی۔ انکی نسبت بیان کیا جاتا ہے۔ کہ وہ عربوں سے بھی راستوں اور پگڈنڈیوں سے زیادہ واقف تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد لارنس محکمہ نقشہ کشی سے خبر رسانی میں تبدیل کئے گئے۔ انکا کام دشمن کے کیمپ سے خبروں کا لانا تھا۔ اُن کا فرض تھا۔ کہ وہ سپہ سالار کو ترکوں کی نقل و حرکت سے اور ضروری معاملات کی اطلاع دیتے رہیں۔ سر ارچیبلڈ مرے جو برطانوی افواج کے رکن اعلیٰ تھے۔ لکھتے ہیں بسا اوقات لارنس نے ایسی معلومات بہم پہنچائیں۔ کہ برطانوی فوجیں وقت پر گرفتار ہونے سے بچ گئیں"۔

۱۹۱۵ء میں جو انقلاب عربوں نے ترکوں کیخلاف برپا کیا۔ وہ محض لارنس کی ہوشیاری وعیاری کا نتیجہ تھا۔

جزیرۃ العرب دنیا کا ایک اہم ترین خطہ ہے۔ وہ انگلستان، ویلز، سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، ہالینڈ، بیلجیم، فرانس اور سپین کے مجموعے سے بھی بڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم کو بہشت سے نکال کر یہیں پھینکا گیا تھا اور حوا ان کو یہیں آکر ملی تھیں۔ اس لئے نسل انسانی کی پیدائش کا پہلا گھر بھی یہی ہے۔ اہل عرب شروع ہی سے دو قسموں میں منقسم ہیں ایک حضری یعنی شہری دوسرے بدوی۔ دنیا قیامت تک عربوں کی مرہون منت رہیگی۔ عرب دنیا کے تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔ حساب، الجبرا، علم الادویات اسی سرزمین کے باشندوں کی ایجادیں ہیں۔ باغات اور اس کی روشیں، چمن اور اس کے فوارے، حمام اور دیگر تہذیب کے لوازم انہیں کی دماغی

اخذ امانت ہیں ارسطو، سقراط، بقراط اور جالینوس سب کو اسی سرچشمہ نے زندہ رکھا۔ اہل عرب سے قبل یورپ کو نشنگی تھی اور آج ان کی شان و شوکت کی شہادت ہسپانیہ زبان حال سے دے رہا ہے۔ یہ وہی عرب تھا جہاں لارنس نے انقلاب برپا کیا اور عرب کے بے تاج بادشاہ کے نام سے شہرت پائی۔

بارھویں صدی عیسوی میں غازی صلاح الدین ایوبی کے جانشینوں نے عرب کو فتح کیا۔ اور ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ اس پر برائے نام حکومت کرتے رہے۔ ترکی اب ترک گئے وہ بھی کروڑوں روپیہ جزیرۃ العرب کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرتے رہے جنگ عظیم کے دوران میں حجاز پر شریف حسین حاکم تھا۔ جو بعد میں شاہ حسین کے نام سے مشہور ہوا اسکی والدہ کوہ قاف کی رہنے والی تھی اسکا بیٹا فیصل لڑائی کے آغاز میں دمشق میں جمال پاشا اور انور پاشا کا مہمان تھا۔ وہ عہد و پیمان کر کے وہاں سے رخصت ہوا۔ اور قرآن پر حلف اٹھایا کہ وہ اور اسکا باپ خلیفۃ المسلمین امیرالمومنین کے لئے اپنی جانیں نثار کر دیں گے۔

مکہ میں پہنچکر وہ تمام عہد و پیمان ٹوٹ گئے۔ مقدس حلف کی وقعت الف لیلہ کی کہانی سے زیادہ نہ رہی۔ باپ بیٹوں نے سر جوڑ کر مشورہ کیا۔ حکومت انگریزی سے امداد طلب کی اور ترکوں کے خلاف بغاوت برپا کر کے ہمیشہ کے لئے اپنی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگوایا۔ بغاوت کی ابتداء مکہ میں نمودار ہوئی اور جس طرح مدینہ نے جو تیرہ سو سال قبل رسول اللہ کے ساتھ وفاداری کی تھی۔ آج پھر اہل مدینہ نے ترکوں کا ساتھ دے کر اپنی شرافت کا ثبوت دیا۔

سنہ ۱۹۱۶ء کے آغاز میں لارڈ لارنس قاہرہ میں تھے۔ انہیں خاص اہتمام کے ساتھ مکہ بھیجا گیا۔ وہ آندھی کیطرح اُٹھے اور بجلی کیطرح سرزمین عرب پر جا چمکے جدہ پہنچکر انہوں نے حالات کا اندازہ لگایا اور فوراً معاملہ کی تہ کو پہنچ گئے۔ عربوں کی اکثریت ترکوں کے ساتھ تھی۔ امیر فیصل کے پاس نہ تو اپنے بچاؤ کے لئے کافی گولہ بارود تھا۔ اور نہ کافی فوج تھی۔ ترکوں نے مدینہ کی حفاظت خوب کر رکھی تھی۔ انہوں نے ایک دستہ فوج کا سرکش حسین اور اسکے باغی بیٹے کی سرکوبی کے لیئے مکہ کیطرف روانہ کیا۔ لارنس جانتے تھے کہ ڈھائی سو میل کا لق و دق صحرا طے کرنا بڑھیا کا سوت نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی۔ لارنس نے سب سے پہلا کام یہ کیا۔ کہ حریص بدوؤں کو نہایت اعلےٰ بندوقیں اور کثرت سے گولیاں تقسیم کر دیں اور رابغ پر انگریزی جنگی جہازوں کو متعین کر دیا۔

ینبوع اور الوجہ کی دو بندرگاہوں پر ترکوں کا قبضہ تھا۔ جہاں سے وہ حجاز ریلوے کی حفاظت کرتے تھے۔ لارنس عرب کے صحراؤں میں دن رات گھومتے۔ بدوؤں میں ترکوں کیخلاف جذبہ منافرت پیدا کرتے۔ کہتے "ترکوں نے ہمیں لوٹ لیا ہے اور ہماری آزادی سلب کر لی ہے۔"

وہ ترکوں کیخلاف اس قسم کی کہانیاں بیان کرتے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے کھڑے ہو جاتے۔ بدوؤں میں وہ "سیدی فیصل" کے نام سے مشہور تھے۔ وہ رات کو عشا کی نماز کے بعد خیمہ کے آگے بیٹھ جاتے۔ عرب کی پرانی داستانیں دہراتے زار و قطار روتے اور کہتے۔ ترکوں نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ بدوؤں کے لئے بھیڑیں

فتح کیجاتیں انواع اقسام کے کباب بنتے۔ گراموفون اور سوئٹزرلینڈ کی سستی گھڑیاں تقسیم ہوتیں۔ وہ اس طور پر عربوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ بدوؤں سے کہتے "آج ہمارا دشمن ترک انگریز، فرانس اور اٹلی کیخلاف لڑنے میں مصروف ہے ہمیں حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنا ملک آزاد کرا لینا چاہیئے۔ جانبازو! ہماری شرافت کے افسانے دنیا میں زبان زد عام ہیں آج اگر ہم نے ترکوں سے بدلہ نہ لیا تو ہمیں قیامت کے دن خدا کے سامنے شرمسار ہونا پڑیگا"

لارنس کی دن رات کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دس ہزار عرب بھرتی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس فوج کو انہوں نے دس حصوں میں تقسیم کیا۔ اور انگریزی بحری طاقت کی وساطت سے نیگوا اور الوجہ پر قبضہ کر لیا۔

امیر فیصل کے بھائی عبداللہ سے مدینہ پر حملہ کرایا گیا۔ مگر اسے شکست فاش ہوئی لارنس کا ارادہ تھا۔ کہ عقبہ پر قبضہ کر کے شام پر حملہ کیا جائے۔ مگر یہ محض ایک تجویز تھی۔ جسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا

بارہا لارنس چھ چھ ہفتہ تک جنگل میں غائب رہتے۔ ایک دفعہ بدوؤں کی جماعت نے جنکی ہمدردی ترکوں سے تھی۔ انہیں گرفتار کر کے بہت زدوکوب کیا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ بدو جب انہیں مارتے تو انکی چیخ پکار، رونا، دھاڑیں مارنا۔ تمام حرکتیں اہل عرب کی سی ہوتیں۔ ان کے لب و لہجہ سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ واقعی بدو ہیں لہٰذا بدوؤں نے یہ سمجھ کر کہ وہ بدو ہیں اور کسی قبیلہ کے معزز فرد ہیں۔ انہیں چھوڑ دیا

جب ٹاپ الیٹس کی فوجیں محصور ہو گئیں۔ تو لارنس نے تین مہینے تک محض کھجوروں اور ذبیحہ کے گوشت پر گذارا کیا۔ ہر روز دو اونٹ ذبح کئے جاتے تھے۔ اور تھوڑا تھوڑا گوشت سب کو تقسیم کیا جاتا تھا۔ آخر جب وہ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ تو لارنس ایک دن ایسا واؤں چلا کر اونٹ پر سوار ہو کر وہاں سے صاف نکل گیا۔ ساٹھ گھنٹے کی مسلسل مسافت کے بعد وہ بندرگاہ توفیق پہنچے۔ ایک ہوٹل میں جس کا نام سفا تھا مقیم ہوئے چھ گھنٹے تک متواتر غسل کرتے رہے۔ اور پھر انگریزی جرنیل سے ملکر مزید فوجیں حاصل کیں اور محصورین کو خلاصی دلانے میں کامیاب ہوئے۔

جب پہلی بار ان کی ملاقات لارڈ ایلن بائی سے مقام اسمٰعیلیہ ہوئی تو لارڈ موصوف انھیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ اس قسم کا نحیف البدن اور پست قامت انسان کس قدر ارادے میں مضبوط اور جری ہے۔

عربوں کی بغاوت کی وجہ سے لارنس کی ساکھ بندھ گئی تھی۔ اسمٰعیلیہ سے وہ یوروشلم پہنچا۔ اس کے کارہائے نمایاں کو صیغہ راز میں رکھا جاتا تھا۔ مگر اتحادی لشکر میں اس سے ہر ایک متنفس واقف تھا۔ لاول ٹامس رقم طراز ہے کہ میں ایک دفعہ یوروشلم میں لارنس سے ملا۔ وہ میرے دیرینہ آشناؤں میں سے تھا۔ وہ جرنیل ایلن بائی اور ڈیوک آف کناٹ کے ہاں دوپہر کے کھانے پر مدعو تھا۔ میں نے جرنیل ایلن بائی سے از راہ استعجاب دریافت کیا۔ کہ لارنس کے عرب کے کارہائے نمایاں کو کیوں صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے مجھے جواب ملا کہ اگر ان کو ظاہر کیا جائے۔ تو خیال ہے۔ کہ ہزاروں عرب ترکوں سے

جا ملیں گے۔"

لارنس کا معمول تھا کہ صبح کے وقت وہ خیمہ کے باہر بیٹھ جاتا۔ سینکڑوں عرب ہر روز ملاقات کے لئے آتے۔ ملاقات کے بعد ملاقاتی اشارہ سے خیمے کے اندر چلے جاتے وہاں اشرفیوں کے صندوق بھرے پڑے رہتے۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ جس قدر چاہے اپنے دونوں ہاتھوں میں آسکیں، اٹھالے۔ باہر نکلنے کے بعد عمدہ قہوہ، نفیس پھلوں اور لذیذ کھانوں سے انکی تواضع کی جاتی۔ اس وجہ سے لارنس عرب میں ابوبکر ثانی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

لارنس صبح کو بیدار ہوتا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر نماز ادا کرتا۔ تلاوت میں کرتا اور پھر امیر فیصل کے خیمہ میں ناشتہ کے لئے چلا جاتا وہاں وہ نہایت بیش بہا قالینوں پر بیٹھ کر عربوں کی طرح ناشتہ کرتا۔ اور بعد کو حقہ کشی میں مصروف ہو جاتا۔ پھر امیر فیصل اور لارنس فوجی امور پر گفتگو کرتے۔ لارنس کے عادات و اطوار ایسے تھے۔ گویا وہ عربی النسل ہے اور کسی نہایت معزز اور شریف باپ کا بیٹا ہے۔

لارنس کی دن رات کی کوشش سے عربی فوج کی تعداد پچاس ہزار سے متجاوز ہو گئی۔ اس فوج کو اس نے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا تقریباً اس سے دگنی فوج انگریزوں نے باہر کے ملکوں سے بھیج رکھی تھی۔ جب ترکوں کو پتہ چلا کہ طفلہ پر لارنس نے قبضہ کر لیا ہے۔ تو انہوں نے توپخانہ سوار اور پیادہ فوجیں اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے وہاں بھیجیں سہل الحصا پر ترکوں اور لارنس کی فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ ترکوں نے لارنس کو شکست فاش دی۔ مگر لارنس نے نہایت پھرتی کے ساتھ عربوں کو پھر جمع کیا۔ اور ایسی چال چلا کہ شکست فتح میں تبدیل

ہو گئی۔

ایک دن لارنس اور قدری عاصم ایک ہزار بدوؤں کے ساتھ اونٹوں پر سوار صحرا میں گھوم رہے تھے۔ بدو لارنس کی تعریف میں گیت گا رہے تھے۔ اور اسکی فیاضیوں کو حضرت ابو بکر کی فیاضیوں سے تشبیہ دے رہے تھے۔ لارنس نے ایک ریل گاڑی سامان حرب سے بھری ہوئی دیکھی جو ترک مدینہ کے تحفظ کیلئے لا رہے تھے۔ تین دن کی مسافت کے بعد وہ معان پہنچے۔ جو حجاز ریلوے پر ایک مشہور اسٹیشن ہے۔ کچھ عرصہ وہاں انہوں نے قیام کیا۔ رات کے وقت وہ پلوں کو آگ لگا دیتے اور گاڑی سے سامان حرب اور خورد و نوش کا ذخیرہ لوٹ لیتے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے باقاعدہ طور پر ڈائنامیٹ کے ذریعے گاڑیوں کو اڑانا سیکھ لیا۔ اور گاڑیوں کو تباہ کرنے میں انہوں نے کافی ملکہ حاصل کر لیا۔ وہ بدوؤں کو گاڑیاں اڑانے کے وقت ساتھ لیجاتے۔ مگر ان سے صرف گاڑیوں کا مال و اسباب لوٹنے کا کام لیتے۔ لیکن اس فن سے انہیں بالکل نا آشنا رکھتے۔ تاکہ وہ خود اس فن کے ماہر نہ بن جائیں۔ انہوں نے اس قدر گاڑیوں کو برباد کیا تھا۔ کہ حجاز ریلوے پر پچھلی گاڑیوں کا ٹکٹ اگلی گاڑیوں سے پانچ چھ گنا زیادہ تھا۔ وہ بجلی کا تار لائن کے نیچے دبا دیتے اور خود پانچ گز کے فاصلے پر درختوں میں چھپ رہتے جب انجن تار سے گذر جاتا تو بجلی کی رو جو لارنس کے ہاتھ میں ہوتی چھوڑ دیتا سینکڑوں سکیں مارے جاتے اور لاکھوں روپے کا مال غنیمت لارنس کے ہاتھ آتا۔ حبیب جرمنی نے عقبہ پر ہوائی جہازوں سے حملہ کیا تو حسین نے مفصلہ ذیل خط لارنس کو لکھا۔

امیر المومنین!

آپ کی سلطنت کے پاس متعدد ہوائی جہاز موجود ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہماری حفاظت کے لئے تین درجن ہوائی جہاز ملک معظم سے منگوا کر ہمیں مشکور کر دینگے۔

آپ کا صادق دوست

حسین

لارنس کے خاص محافظوں میں سے ایک شخص عبداللہ نامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ جب بدوؤں سے کوئی سنجیدہ اہمیت کا کام لینا ہوتا... تو لارنس عجیب و غریب تحائف کا لالچ دے کر چاندی اور سونے کی چمک سے اُنکی آتش حرص کو تیز کراتا۔ نفیس اور خوبصورت کپڑوں کے خواب دکھا کر ہوا میں وہ محلات تعمیر کرتا۔ کہ بدوؤں کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر عبداللہ بدوؤں کو ڈانٹتا اور کہتا "خدا کی قسم اگر یہ کام نہ ہوا۔ تو میں تمہیں زندہ آگ میں جلا دوں گا۔" بسا اوقات اس نے غریب عربوں کو زندہ زمین میں گڑوا دیا۔ اور کئی ایک کی کھالیں کھچوا دیں۔

عرب کے معاملات سے فراغت پا کر لارنس نے اپنی توجہ شام کی طرف مبذول کی۔ وہ عبداللہ کے ساتھ عربوں کے لباس میں دمشق پہنچا تین دن متواتر دمشق کے بازاروں میں گھومتا رہا۔ اس اثناء میں ترکوں کے ملٹری گورنر علی رضا پاشا سے یارانہ گانٹھ لیا۔ لاکھوں روپے علی رضا کی نذر کر کے راز ہائے سربستہ سے واقفیت حاصل کر لی۔ بعد علی رضا سے مدد کا قطعیہ وعدہ لے لیا۔

گورنر مذکور نے لارنس کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی۔ گورنمنٹ ہاؤس میں چراغاں کیا گیا۔ لارنس نقشہ جات اور دیگر ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد عرب کی جانب مراجعت کر گیا

مکہ میں پہنچ کر ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ تمام عرب سرداروں کو دعوت دی گئی۔ اور فیصلہ لیا گیا کہ شام کا علاقہ فتح کرنے کے بعد شاہ حسین کے سپرد کیا جائیگا۔ حملہ سے پہلے حالات کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے لارنس پھر شام کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ایک شامی کوٹ پہن کر درعا کی گلیوں میں گھوم رہا تھا کہ ترک سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ لارنس نے اپنا نام احمد بتایا۔ اور کہا کہ وہ شیخ طالع کا چھوٹا صاحبزادہ ہے۔ سپاہی اس کو اپنے افسر کے پاس لے گئے۔ اور انہوں نے اسے اس قدر مارا کہ لارنس بیہوش ہو گیا۔ سپاہی سمجھے کہ وہ مر گیا ہے۔ اس لئے اسکی لاش کو بغیر حفاظت کے چھوڑ دیا۔ جب آدھی رات کے وقت اسے ہوش آیا۔ تو لارنس وہاں سے ایسا غائب ہوا کہ پھر اسکا ملنا آسان کام نہ تھا۔

ایک دفعہ وہ شہر عمان میں ترکوں کے لشکر میں عورت کے لباس میں جاسوسی کر رہا تھا۔ چند ترک سپاہیوں نے اسے دیکھ لیا۔ اور اس کا پیچھا کیا۔ لارنس نے انہیں ایسے جل دئے کہ بچکر صاف نکل گیا۔ ان تمام کاروائیوں اور جاسوسیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دمشق اتحادیوں کے قبضے میں آ گیا۔

نومبر ۱۹۱۷ء میں ایک عظیم انقلاب دمشق میں برپا ہو گیا۔ یہ انقلاب امیر عبدالقادر نے

جو ترکوں کا حامی تھا۔ آناً فاناً ناپید کر دیا تھا۔ امیر عبدالقادر الجزائر کے رہنے والے
تھے۔ جن کے ڈر سے نے فرانس کے دانت کھٹے کئے تھے۔

امیر عبدالقادر نے دمشق میں وہ فضا پیدا کر دی تھی۔ کہ لارنس کو فوراً بذریعہ تار بلایا گیا۔
اور وہ متواتر ایک ماہ کی کوشش کے بعد واقعات پر قابو پانے میں کامیاب ہوا۔

اس کے بعد لارنس نے بیت المقدس اور یروشلم پر قبضہ جمانے کی تجاویز پر غور کیا۔
جولائی ۱۹۱۸ء میں وہاں حملہ کیا گیا۔ اور تھوڑے ہی وقفہ میں لارنس کی ریشہ دوانیوں سے
وہاں بھی اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو صبح کے وقت لارنس جسکی عمر اُسوقت صرف انتیس ۲۹ سال کی تھی۔ دمشق
میں بطور فاتح داخل ہوئے۔ غدار عرب اور یہ۔ اُس کے استقبال کے لئے جوق جوق جمع تھے
لارنس عربوں کا سفید لباس زیب بدن کئے ہوئے تھا۔ اور سینکڑوں عرب سردار اس کے
ساتھ تھے۔ ایک شخص شکری الایوبی جسکی نسبت یہ کہا جاتا تھا۔ کہ وہ غازی صلاح الدین
کے خاندان سے ہے۔ دمشق کے گورنر مقرر کیا گیا۔ ان ایام میں لارنس دمشق کا بادشاہ
سمجھا جاتا۔

جب اتحادیوں نے دمشق پر پورا قبضہ جما لیا۔ تو فرانسیسی مُصر ہوئے۔ کہ شہر پر فرانس
کا جھنڈا نصب کیا جائے ملٹری گورنر جسکی رگوں میں غازی صلاح الدین کا خون دوڑ رہا
تھا۔ اُس شخص کو جو عربی جھنڈا اکھاڑنے کے لئے ٹاؤن ہال میں آیا تھا۔ ریوالور سے گولی کا
نشانہ بنا کر اپنی جان پر کھیل گیا۔ اور دنیا کو بتا دیا۔ کہ ابھی تک نام و ناموس پر کٹ جانیوالے

شریف انسان موجود ہیں۔

اگرچہ شام اور یروشلم پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ تاہم شہر کے محصورین ... اسی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ فخری پاشا سپہ سالار تھے۔ جنکو بعد میں اتحادیوں نے شیروں کا خطاب دیا تھا۔ لارنس نے تمام چالیں چلیں۔ مگر ان کو سر کرنے میں کوئی چال کامیاب نہ ہوئی۔ فخری پاشا کو پیغام بھیجے گئے۔ کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں تو اُن سے نہایت عمدہ سلوک کیا جائیگا۔ کروڑوں روپے نذر کئے جائیں گے۔ مگر جو جواب اس انسان نے دیا۔ وہ دنیا کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے "اگر تمام دنیا کی بادشاہت اور خزانے مجھے پیش کئے جائیں۔ پھر بھی میں اُنکو حضور تاجدار مدینہ کے نام کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں"۔ ٹامس لاول لکھتے ہیں۔ "اگر ٹرکی کے پاس چھ آدمی فخری پاشا جیسے دل گردے کے ہوتے تو آج جنگ عظیم کا نتیجہ بالکل اور ہوتا"۔ یہ فخری پاشا ہی تھے۔ جو غازی امان اللہ کے عہد میں ٹرکی کے سفیر ہو کر کابل آئے تھے۔

عارضی صلح کے بعد لارنس نے سونے کی وہ تلوار جو شاہ حسین نے اُس کو بطور "شہزادہ عرب" پیش کی تھی۔ کمر سے کھول ڈالی۔ اُس نے تمام عربی کپڑے اتار دیئے اور عازم لنڈن ہو گیا۔ لارنس نے وہ کام کر دکھایا جس کے لئے یورپ صدیوں سے منتظر تھا۔

لڑائی کے بعد عربوں کی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے محسوس کیا۔ کہ وہ مقدس

عہد و پیمان اور حلف روی کاغذ کے پرزے تھے۔ امیر فیصل صلح کی کانفرنس میں پیرس پہنچے۔ جہاں ان کے اصرار پر لارنس بھی آگئے۔ لارنس نے صاف صاف کہہ دیا۔ "کہ عربوں نے ترکوں کے خلاف غداری اس وجہ سے نہیں کی تھی۔ کہ فرانسیسی اُن پر حاکم ہوجائیں گے بڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا۔ کہ فرانس بیروت اور شام پر قابض ہو۔ انگلستان کا اقتدار عراق عرب پر ہو۔ بیت المقدس میں یہودی سلطنت کی بنیاد ڈالی جائے۔ اور شاہ حسین کو عرب کا بادشاہ مقرر کیا جائے

جب لارنس لڑائی سے فارغ ہو کر واپس انگلستان جا رہا تھا۔ تو مارسیلز میں اُس نے اسٹیشن ماسٹر سے گاڑی کا وقت دریافت کیا۔ لارنس اور کوٹ پہنے تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے یہ خیال کر کے کہ وہ کوئی معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ چنداں پروا نہ کی اور جواب دیا۔ "کہ آپ میرے اسسٹنٹ سے جو امور دریافت طلب ہوں اُن کے متعلق معلومات حاصل کر لیں"۔ لارنس کمرہ کے اندر چلا گیا۔ اور اپنا کوٹ اتار ڈالا۔ پھر وہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس آیا۔ جس نے اُسے کرنیل کی وردی میں دیکھ کر نہایت ادب سے فوجی سلام کیا۔ اور تمام معلومات ایک منٹ کے اندر بہم پہنچادیں۔

لڑائی کے اختتام پر امیر فیصل لندن آئے۔ لارنس اُنکے ساتھ تھا۔ اُن کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ شاندار دعوتیں ہوئیں۔ استقبال ہوئے۔ اور یہ سب کچھ لارنس کے طفیل تھا۔

لڑائی کے کئی سال بعد لارنس کے ایک نہایت عزیز دوست کی شادی ہوئی۔

لارنس نے دوست سے اظہار تاسف کیا۔ کہ میرے پاس عمدہ تحفہ دینے کے لئے کافی روپیہ نہیں ہے۔ اس پر بے تکلف دوست نے کہا تو پھر اپنی ڈائری کے چند اوراق میری نذر کر دو۔ چنانچہ لارنس نے ایسا ہی کیا۔ اور دوست مذکور نے ان اوراق کو امریکہ کے ایک پبلشر سے بعنوان " دنیا کے اہم کام " چھپوا کر ہزاروں روپیہ کا استفادہ کیا۔

صلح کے بعد لارنس پھر غائب ہو گیا۔ لوگ عجیب و غریب قیافے لگانے لگے۔ کوئی کہتا وہ شام میں ہے کسی نے اُسے افغانستان میں دیکھا۔ بعض کہتے وہ عرب میں ہے الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر اسکے متعلق ٹھیک حالات کسی شخص کو معلوم نہ ہو سکے۔

ٹامس لاول جو عرب میں اس کا رفیق اور یار غار رہا۔ دو سال تک اسکی تلاش میں تھا۔ مگر اُسکا کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر جب ٹامس لاول نے عربوں کے متعلق ایک ڈرامہ لکھا۔ اُسے پردہ پر دکھلایا۔ تو اگلی صبح کو لارنس کا ایک خط ٹامس لاول کو ملا جسمیں اس نے کہانی کی تعریف کی اور مزید کہا کہ " ہال میں روشنی نہ تھی۔ ورنہ لوگ مجھے پہچان لیتے "

فرانسیسی حکومت نے لارنس کو " کرواہ دی گارز " کا خطاب عطا کیا۔ مگر اُس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ گورنمنٹ انگلشیہ نے اُسے " وکٹوریہ کراس " اور " نائٹ ہوڈ " کے معزز خطابات پیش کئے۔ اس نے انکار کیا اور کہا کہ اگر میں خطاب قبول کر لوں تو میرا درزی فوراً میرے بل کو دگنا کر دیگا۔ چونکہ مجھ میں ادائیگی کی طاقت نہیں۔ اسلئے مجھے معاف فرمایا جائے۔

ایک دفعہ لڑائی کے بعد ٹامس لاول نے اس سے دریافت کیا " کہ دنیا میں ایسی کوئی چیز ہے جو تمھیں دستیاب ہو۔ اور تمہارے لئے باعث مسرت " لارنس ہنسا اور

کہا "ہاں میری خواہش ہے۔ کہ ایک رولز رائیس ہو۔ تیل کا کنواں ہو۔ اور اتنے ٹائر اور ٹیوب ہیں کہ مجھے زندگی بھر کبھی خریدنی نہ پڑیں"۔

لارنس نے صرف ایک اعزاز خوشی سے قبول کیا۔ اور وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے کالج ۔۔۔۔ آل سولز کی فیلوشپ تھی۔ یہ اعزاز انگلستان میں نہایت ارفع اور اعلےٰ سمجھا جاتا ہے۔ اور صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ جو خاص قابلیت اور دماغ کے مالک ہوتے ہیں۔ مثلاً لارڈ کرزن آل سولز کالج کے فیلو تھے اور ایسی ہی مقتدر ہستیاں اس کے لئے منتخب کیجاتی ہیں۔ فیلو منتخب ہونے کے بعد لارنس نے ایپنگ فارسٹ میں اپنے لئے ایک مکان بنا لیا۔ اور تجرد کی زندگی میں عرب کے متعلق کتابیں لکھنے میں ہمہ تن مصروف رہا۔ اس کے ملازم کا بیان ہے۔ کہ میں عموماً لارنس کو کئی کئی دن تک نہیں دیکھتا مجھے حکم ہے۔ کہ میں اس کے لئے رات کا کھانا کمرے میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ دفتر نو آبادیات کے اصرار پر لارنس نے دفتر مذکور میں دو سال کے لئے کام کرنے کا وعدہ کیا۔ جس دن میعاد مقررہ ختم ہوئی۔ وہ چپکے سے چلا گیا ۔۔ اور پھر دفتر میں کبھی واپس نہ آیا۔

جب لارنس عرب میں تفحص اور جستجو میں مشغول تھا۔ تو کسے معلوم تھا۔ کہ وہ آل عثمان کی سلطنت کے حصے بخرے کرنے میں کامیاب ہوگا۔ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ وہ حضرت عمر کی قائم کردہ مستحکم سلطنت کی بنیادوں کو ہلا دے گا۔ بیشک جب کوئی مؤرخ ٹرکی کے عروج و زوال کی تاریخ قلمبند کرنے میں مشغول ہوگا۔ تو پہلے باب

کرنل ٹامس لارڈ لارنس

کی ابتدا اس طرح کرے گا۔ "کہ آثارِ قدیمہ کی تفحص کے لئے ایک نوعمر لڑکا ملک عرب میں وارد ہوا تھا۔ جس نے آلِ عثمان کی سلطنت کو تہ و بالا کر دیا۔"







مسولینی



اگلی کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ عظیم الشان انسانوں کی پیدائش کے وقت ایسے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ کہ انسانی عقل ان کے سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اُنکی زندگی کا ہر لمحہ سبق آموز رازوں کا حامل ہوتا ہے۔ قومیں اُن پر عمل پیرا ہو کر حیات ابدی پاتی ہیں۔ اور ایسے لوگوں کا وجود دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیتا ہے۔ انہی لوگوں کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے ۔

"قرن ہا باید کہ تا ایک مرد حق پیدا شود"

بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ۲۹ جولائی ۱۸۸۳ء کو اتوار کے روز دو بجے بعد دوپہر داپیا کی پارک سکان برن میں عقاب کے بت پر جو وہاں آویزاں تھا اور جس کے دو سر تھے۔ بجلی گری۔ جس کی مثال دنیا نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ بجلی نے عقاب کے دونوں سروں کو اس طور پہ جھیل میں اڑا کر پھینک دیا۔ گویا وہ سر سے تراشے ہی نہیں گئے تھے۔ داپیا کے لوگوں نے پیشین گوئی کی۔ کہ دنیا میں کسی بڑی ہستی کا تولد ہوا ہے۔ ٹھیک اسی وقت اٹلی کے ایک گاؤں ڈوویا میں ایک آہنگر الیسٹرو مسولینی کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا جس کا نام بینیتو مسولینی رکھا گیا۔ آہنگر کی بیوی کا نام روزا تھا۔ اگرچہ وہ نہایت مفلس تھے۔ مگر ان کے باہمی

تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ اور محبت کی زندگی میں دنیاوی تکالیف کا کوئی اثر ان پر نہ تھا۔

اٹلی کی تاریخ میں مسولینیز کا نام نہایت وقار اور عزت سے لیا جاتا ہے ۱۲۷۵ء کے قریب ان کے خاندان کا ایک فرد کوئی مسولینی صوبہ بولا نا کا گورنر تھا۔ اگرچہ ملکی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ان کی حالت بگڑ چکی تھی مگر بلحاظ نسب و شرافت عوام ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ اور اس واقع کی شہادت یہ ہے۔ کہ شہر بولانا میں آج تک ایک بڑے بازار اور مینار کا نام ان کے نام سے منسوب چلا آتا ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ان کے خاندان کے ایک فرد نے انگلستان میں اقامت اختیار کر لی اور فن موسیقی میں امتیاز حاصل کیا۔

نوزائیدہ بچہ کا نام مشہور و معروف مکسیکن بینیٹو مسولینی کے نام پر رکھا گیا جس نے مکسیکن شہنشاہ کو قتل کیا تھا۔ مسولینی کی ماں گاؤں کے اسکول میں معلمہ تھیں۔ غریب معلمہ کو صبح کے آٹھ بجے سے شام تک پیٹ پالنے کے لئے کام کرنا پڑتا۔ اس لئے ننھے کو آغاز ہی سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ غربت اور افلاس میں پرورش پا رہا ہے۔

ابتدائی تعلیم مسولینی نے اپنی والدہ سے حاصل کی۔ مگر جب اسکول جانے کا وقت آیا۔ تو ایک گاؤں پراڈپو میں جو ان کے گاؤں سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ اسے داخل کرایا گیا۔ قدرتی طور پر اسکول میں بچوں نے نووارد اجنبی کو خوش آمدید نہ کہا۔ بلکہ اس سے ایک قسم کا حسد کرنے لگے۔ اسوجہ سے سکول آتے اور جاتے ہوئے لڑکوں کیساتھ

عموماً لڑائیاں ہوتیں جن میں مسولینی اکثر فتحمند ہوتا۔

اسکول کے منازل طے کرنے کے بعد اُسے ایک دوسرے سکول میں جو راہبہ عورتوں کا اسکول تھا۔ اور بمقام فیزنا واقع تھا بحیثیت اقامتی طالب داخل کرایا گیا اسکول کے معلمین اپنے شاگرد کی ذہانت سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ مسولینی کتب خانہ میں گھنٹوں اپنا مطالعہ جاری رکھتا۔ اُسکے متعلق سکول میں عام طور پر مشہور تھا۔ کہ اگر ایک دفعہ وہ کتب خانہ میں گھس جائے تو وہاں سے اُس کو نکالنا مشکل تھا۔

تھوڑے وقفہ کے بعد اسے لاطینی اور روانتے کی تصانیف میں خاص استعداد حاصل ہوگئی۔ جماعت کے باہر اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو قابل ذکر ہو۔ گرجا جانے سے اُسے نفرت تھی۔ وہ کہا کرتا "موم کی شمعیں میرے دل میں وحشت پیدا کرتی ہیں۔ گرجا کا باجا اضطراب کا باعث ہوتا ہے۔ اور گرجے کے گرد و نواح دیکھنے سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ اور میری قلبی تسکین جاتی رہتی ہے۔"

دو دفعہ اُس کا طرز عمل مذہب کے بارے میں اس قدر قابل اعتراض ہوا کہ اسکول کے معلمین نے اُسے اسکول سے نکال دینے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر اس کی والدہ کی منتوں اور آنسوؤں سے معلمین کے دل پسیج گئے۔ ہم یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ فیزنا کے اسکول نے اُس کے چال چلن پر ایک گہرا اثر چھوڑا جو آج تک نمایاں ہے۔

پندرہ سال کی عمر میں وہ فیزنا کا اسکول چھوڑ کر اپنے گھر چلا آیا۔ اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ معلمی کو اپنا پیشہ بنائیں اس مقصد کی وجہ سے وہ ایک درس گاہ میں جو فارمپی

میں واقع تھی۔ استاد بننے کے لئے داخل ہو گیا۔ ان ایام میں ایک رات اس کی والدہ نے اس کے کمرے سے ایک اونچی آواز سنی۔ وہ حیرت اور اضطراب کی حالت میں مسولینی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تو دیکھا کہ اسکا لاڈلا بیٹا فصیح و بلیغ لیکچر دینے کی مشق کر رہا ہے۔

فاینیمپی کی درس گاہ سے سند حاصل کرنے کے بعد اسے روزگار کی تلاش ہوئی مگر یہ آسان کام نہ تھا۔ مسولینی کی شہرت میں یہ دھبا لگ چکا تھا۔ کہ وہ موجودہ طرز حکومت کے خلاف ہے۔ اس لئے کوئی اسکول اسے اپنی ملازمت میں لینے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ جب اسکول کی ملازمت حاصل کرنے سے مایوس ہو گیا۔ تو اس نے میونسپلٹی کی ایک آسامی کے لئے درخواست کی۔ مگر وہاں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اسوقت اس نے کہا۔ میونسپلٹی نے تقرر نہ کرنے میں ازحد غلطی کی ہے۔ ایک وقت آئیگا۔ کہ اُسے پچھتانا پڑیگا"۔ اسوقت اسکا سن صرف اٹھارہ برس کا تھا۔

آخر کار اسے ادنے درجہ کی معلمی ایک گاؤں گلیبرا میں مل گئی چھیالیس لیرا اسکی ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس تنخواہ سے اسے چالیس لیرا رہائش اور خوراک کے ادا کرنے پڑتے۔ چالیس لڑکوں کی ایک جماعت اس کے سپرد کی گئی۔ اسکول کے اوقات آٹھ سے ایک بجے تک تھے۔ اسے آدھا دن فراغت ہوتی۔ مگر ایسی کی تنخواہ سے اسے کچھ نہ بچتا۔ جس سے وہ تفریح طبع کے لئے کچھ خرچ سکتا۔ چند نوجوان ہم عمر لڑکوں سے اسکی دوستی ہو گئی۔ اور کبھی کبھی ان کے ہمراہ اتوار کو وہ ناچنے کے لئے چلا

جاتا تھا۔

اسی گاؤں میں پہلی دفعہ اُس کی توجہ سوشلزم کی طرف مبذول ہوئی۔ تھوڑے وقت کے اندر مارکس بیبل بیباف اور جارج سیوئی کی تمام کی تمام تصنیفات اُسے زبانی یاد ہو گئیں۔ وہ ایک عملی انسان بننا چاہتا تھا۔ محض لفاظی سے اُسے نفرت تھی۔ سوشلزم اختیار کرنے کے باوجود اُس نے حب الوطنی کو خیرباد نہ کہا تاہم حب الوطنی کے اصول جو اُس نے اختیار کر رکھے تھے۔ حکومت کو پسند نہ آئے۔ بحالت معلمی اُس نے ایک تقریر آدھ گھنٹے کر نوٹس پر تیار کی جسکا موضوع گیری بالڈی تھا۔ تقریر سے صاف عیاں تھا۔ کہ وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔ اور اس شخص کی جس نے ملک کی خدمت کی ہو دل سے قدر کرتے۔

معلمی سے تنگ آکر ایک سال گذر جانے کے بعد وہ مستعفی ہو کر سوئٹزر لینڈ چلا گیا۔ اُنکی مالی حالت اس قدر کمزور تھی۔ کہ جب وہ سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ تو اُسکی جیب میں صرف تین لیرا کی رقم تھی۔ اپنا پیٹ پالنے کے لئے اُسے مزدوری کا کام کرنا پڑا۔ لوزان پہنچکر ادنیٰ اوزا میں اسسٹنٹ اڈیٹر کی اسامی اُسے مل گئی۔ تنخواہ نہایت ہی قلیل تھی۔ اخبار مذکور کے چھ ہزار خریدار اطالوی قوم سے تھے۔ اور ان کے تقرر کی یہی وجہ تھی۔ اس اسامی پر وہ اپنا تمام وقت بسر نہ کرتے۔ بلکہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے کہیں اور جگہ محنت مزدوری کرتے یہ وہ وقت تھا۔ جب کہ وہ نہایت تنگی سے زندگی بسر کرتے۔ اِن کی والدہ گاہے گاہے ایک قلیل رقم انکے پاس بھیج دیتیں۔ جو بسا اوقات ان کی روح اور جسم کو برقرار رکھنے میں

نہایت مفید ثابت ہوتی۔ اگرچہ ضروریات زندگی کو انہوں نے بہت ہی کم کر دیا تھا تاہم گذرا وقات بہت مشکل تھی۔ بارہا ان کی فاقوں سے گذرتی۔ اور اکثر وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک دفعہ کھانا کھاتے لیکن یہ بات نہایت قابل تعریف ہے۔ کہ باوجود اس عسرت کے انہوں نے وہ تمام لیکچر سنے جو لوزان میں ہوئے۔ فراغت کے وقت وہ کتابیں پڑھتے اور پروفیسر لیبٹو کے تمام لیکچروں میں جو پولیٹیکل ایکانمی پر انہوں نے لوزان میں دیئے۔ باقاعدہ طور پر شامل ہوتے لوزان ہی میں انہوں نے نیٹشے کی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا۔ اور ان کی موجودہ زندگی میں حکیم مذکور کی تعلیم کا ایک نمایاں حصہ پایا جاتا ہے۔

لوزان کی اقامت کے زمانہ میں وہ ان تمام لوگوں سے ملے۔ جو پولیٹیکل وجوہات کی بنا پر اپنے اپنے ملکوں سے بھاگ کر سوئیٹزرلینڈ میں مقیم تھے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ انہی ایام میں انکی ملاقات لینن اور ٹراسکی سے ہوئی۔ بحالت صدر جمہوریہ لینن نے اس نوجوان کی بابت کہا "میں مسولینی کو خوب جانتا ہوں۔ افسوس ہے کہ سوشلسٹ پارٹی نے اس ہوشیار شخص کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ ورنہ وہ اٹلی میں اشتراکیت کا پرچار کر کے انقلاب پیدا کر دیتا"۔

انہوں نے سوئٹزرلینڈ میں کچھ تقریریں کیں۔ جن کی بنا پر حکومت نے انہیں لوزان سے نکال دیا۔ اور حکم دیا۔ کہ جینوا میں بھی داخل نہ ہوں۔ اس حکم کے بعد ۱۹۲۲ء سے پہلے وہ کبھی لوزان میں داخل نہیں ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں وہ بحیثیت وزیر اعظم اٹلی لارڈ کرزن سے ملنے کے لئے لوزان آئے۔

وزان سے اخراج کے بعد وہ مارسیلز پہنچے جہاں انہوں نے ایک ہڑتال کرادی۔ اس سے وہاں سے بھی نکالے گئے۔ وہاں سے وہ زیورچ پہنچے اور ۱۹۱۰ء تک وہیں مقیم رہے۔ زیورچ سے وہ اٹلی آئے۔ اور گیارھویں رجمنٹ میں جو ویرونا میں مقیم تھی بطور سپاہی شامل ہو گئے۔ فوج کا کرنیل انکی انقلابی طبیعت سے خوب واقف تھا۔ اس لئے انکی خوب جانچ پڑتال رکھتا۔ وہ اس امر سے متحیر تھا۔ کہ وہ بحیثیت سپاہی نہایت قابل تھے۔

۱۹۰۵ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمہ جانکاہ سے انکی طبیعت پر گہرا اثر ہؤا۔ وہ محسوس کرتے تھے۔ کہ انکی والدہ کے انتقال سے ان کے ایک محبوب اور شفیق دوست کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ وہ چیختے چلاتے اور کہتے۔

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تیری خدمت کے قابل جب ہؤا تو چل بسی

اس انتہائی صدمہ کی وجہ سے انہیں فوجی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ یہ عام اصول ہے۔ کہ عظیم الشان ہستیوں کا اصلی جوہر ان کی تکالیف میں زیادہ چمکتا ہے۔ فوجی ملازمت کا اتنا فائدہ ضرور ہؤا کہ وہ اپنے ہموطنوں کی سرشت اور انکی ضروریات سے بخوبی واقف ہو گئے ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ اپنے گھر چلے آئے۔ اور عرصہ دراز تک اپنے والد کے پاس مقیم رہے۔ بھلا ایسی جوشیلی طبیعت کو کیسے سکون ہو سکتا تھا۔ ان کی طبیعت اچاٹ ہو گئی

اور انہوں نے پھر گھومنا شروع کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے پھر اپنے پرانے پیشے معلمی کی طرف رجوع کیا۔ لیکن زیادہ دیر تک اس پر قائم نہ رہ سکے۔ انہوں نے ایک انقلابی پرچہ شائع کیا جس کے سلسلہ میں وہ آسٹریا جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے حکومت کے خلاف اس قسم کے مضمون لکھے کہ حکومت نے انہیں اپنے ملک سے خارج کر دیا۔ وہاں سے وہ ٹرنٹ پہنچے۔ اور کچھ عرصہ ہندوستانی حساب اور جرمنی اور ہسپانوی زبانوں کے سیکھنے میں مصروف رہے۔ ان ایام میں انہوں نے ہسٹری آف فلاسفی لکھنی شروع کی۔ مگر وہ ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بہر حال انہوں نے دو کتابیں لکھ ہی ڈالیں۔ ایک کی جاہنس کی سوانح حیات تھی۔ اور دوسری ایک افسانہ تھا جس کا نام ڈوما پیٹا ہے۔ مؤخر الذکر کا ترجمہ انگریزی زبان میں "کارڈینل مسٹرس" کے نام سے ہو چکا ہے اور وہ نہایت اعلےٰ پایہ کی کتاب ثابت ہوئی ہے۔ ایک ڈرامہ بعنوان "نیپولین کے سو دن" لکھا۔ وہ خود اس امر کے معترف ہیں۔ کہ ڈرامہ کوئی اعلےٰ پایہ کی چیز نہیں ہے۔ ٹرنٹ میں انہوں نے صحافت کے فن پر اس قدر قابو پایا کہ وہ قادر الکلام شخص سمجھے جانے لگے۔

ٹرنٹ سے وہ اپنے گاؤں واپس چلے آئے۔ اور سوشلسٹ اخبار "لوئی" کی ادارت قبول کر لی۔ وہاں سے انہیں ۲۰ لیرا تنخواہ ملتی جن سے وہ اپنے ننھے بچے اور بیوی کی پرورش کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے لیکچر نہایت ضروری چیز ہے۔ اس احساس کے آتے ہی انہوں نے لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔

اس علاقہ کی قدر و منزلت جہاں وہ مقیم تھے۔ بہت بڑھ گئی جس طرح ہنڈ سافٹ کاونٹا گلمڈی کے قیام سے تھا۔ اور برمنگھم کا جوعروف چیمبرلین سے۔ اسی طرح اس چھوٹے سے گاؤں کا دنقار۔ اس نوجوان اڈیٹر کی اقامت سے بہت زور پر تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے اخبار کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا کہ اخبار ایک مقدس مشن ہے۔ ہم نے جلب منفعت کے لئے صحافت کو اختیار نہیں کیا۔ ہم اخبار اس لئے نہیں لکھتے کہ اسکی دل آویز دلچسپیوں سے دل بہلائیں۔ بلکہ اخبار ایک اعلیٰ النصب العین ہے۔ اور ہماری روح رواں ہے ہماری پارٹی کا دستورالعمل ہے۔ جو ہمیں فتحمندی کے منتہا پر لے جائیگا"۔

الغرض انکے نقطۂ نگاہ سے صحافت ان کے لئے نصب العین نہیں۔ بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ تھا اخبار کے ذریعہ وہ اپنے اغراض و مقاصد کی تبلیغ کرتے۔ جو ان کے نزدیک نہایت قیمتی چیز تھی۔ مطالعہ اور مشاہدہ کے ذریعے سے وہ اس نکتہ پر پہنچ چکے تھے کہ اٹلی کی اصلاح کا واحد ذریعہ سوشلزم نہیں بلکہ فسطائیت ہے۔ ہم آگے چل کر بتلائیں گے کہ فسطائیت اور سوشلزم میں کیا فرق ہے۔ ایک اور موقعہ پر انہوں نے لکھا "ہماری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند ہے۔ جس کے پہلے باب میں یہ لفظ لکھے ہوئے ہیں۔ علم کوشش اور مصیبت لازم و ملزوم نہیں۔ ہم محض نیک ہونے سے مضبوط ہو سکتے ہیں۔ اخبار ہمارے لئے ایک میدان کارزار کی مانند ہے۔ جہاں ہم لڑتے ہیں اور ہمارے ہاتھ میں تلوار کیطرح قلم ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں لڑائی میں کام آتی ہیں۔ اطالیہ پارلیمنٹ کوئی کام نہیں کرتی۔ اڑھائی سو ممبر قوم کی گردن پر سوار جونک کی طرح قوم کا خون چوس رہے

ہیں۔ ہم یا تو اس میدان کارزار میں اس جونک کا خاتمہ کر ڈالیں گے۔ یا ہم خود قربان ہو جائیں گے۔ موجودہ طرز حکومت نہایت بوسیدہ اور پرانا ہے۔ ہمیں اس پارلیمنٹ سے کیا فائدہ ہے۔ جو محض خون چوسنے کے لئے بنی ہوئی ہے۔"

اکتوبر ۱۹۱۰ء میں شہر میلان میں پارٹی کانگریس کا اجلاس تھا۔ اس وقت تک انہوں نے سوشلسٹ پارٹی سے قطع تعلق نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ وہاں پہنچے۔ ان کا پروگرام پارلیمنٹ کی اصلاح اور انقلاب پیدا کرنے کے موضوع پر تقاریر کرنے کا تھا۔ مگر ان کی تجاویز رد کر دی گئیں اور انہیں تقریر کی اجازت نہ ملی۔ وہ مایوس ہو کر واپس آ گئے۔ اور اپنے اخبار میں سوشلسٹ پارٹی کے خلاف زبردست مقالے لکھے انہوں نے لکھا "سوشلسٹ پارٹی کا پروگرام سوشلسٹ نہیں ہے۔ سوشلسٹ پارٹی عطار کی ایک ۔دی دوکان کی مانند ہے۔ جو دیوالیہ ہو چکی ہے۔ سوشلسٹ پارٹی ملک کو نجات نہیں دلا سکتی وہ قعر ذلت میں ملک کو گرانے کے لئے تیار ہے۔ اور اگر کسی ذریعہ ملک کی نجات ہو سکتی ہے تو وہ محض فسطائیت کے اصولوں پر چلنے سے ہے۔ اور انہیں اصولوں پر کاربند ہو کر ملک ترقی کر سکتا ہے۔"

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے ٹرکی پر فوج کشی کی۔ اور طرابلس الغرب پر قبضہ جما لیا۔ مسولینی نے اس قدر مخالفت کی اور دوران تقریر میں کہا "یہ لڑائیاں محض شاہی ہوس برقرار رکھنے کی خاطر ہو رہی ہیں۔ لڑائی کا مقصد ملک کی وسعت کرنا ہے۔ مگر ہم آزاد اٹلی چاہتے ہیں۔ جس کی زمین کی عمدہ کاشت کی گئی ہو۔ جہاں کے باشندے خوشحال

ہوں۔ میں وہ اٹلی دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس کے لوگ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ وہ فارغ البال ہوں اور اسکے بچے گلی کوچوں میں بھوک کے نہ مرتے ہوں"۔

جب انہوں نے اس امر کا تہیہ کر لیا۔ کہ وہ طرابلس الغرب کے چلنے کی مخالفت کرینگے۔ تو انہوں نے ملک میں اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اگرچہ اسوقت انکا اثر تمام ملک پر نہ تھا۔ تاہم اس علاقہ میں جہاں وہ مقیم تھے۔ اور ملحق علاقہ میں حکومت کیخلاف ہیجان عظیم پیدا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حکومت کیخلاف مظاہرے اور ملک میں جابجا بلوے ہونے لگے۔ حکومت نے خاص طور پر فوجوں کو اس علاقہ میں بھیجا۔ اور مسولینی کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور عدالت نے ان کے لئے ایک سال کی تجویز کی۔ سزا کا حکم سننے پر لوگ انہیں شہید سمجھنے لگے۔ اور انکی عزت لوگوں کی نگاہوں میں بڑھ گئی۔

۱۹۱۲ء میں ان کے والد ماجد نے ستاون سال کی عمر میں انتقال کیا۔ جس سے ان کی طبیعت پر گہرا اثر ہوا۔ اور یہی وفات آبائی اقامت گاہ سے رشتہ منقطع کرنے کا باعث ہوئی۔ انکی اکلوتی ہمشیرہ کی شادی ہو چکی تھی۔ ان کے بھائی گاؤں سے چلے گئے تھے۔ ایک روز صبح کے وقت اپنے والد کی قبر کو زبان حال سے یہ کہتے ہوئے دیکھنے گئے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اور پھر اس گاؤں میں وہ واپس نہ آئے۔ انگلوٹی کانگرس میں ان کی پارٹی نے انہیں

"اونتی" کا اڈیٹر مقرر کیا۔ اخبار مذکور ایک نہایت اعلے پایہ کا روزانہ پرچہ تھا۔ اور تمام ملک میں بنظر استحسان دیکھا جاتا تھا۔ اگر انکی صحافتی قابلیت پر تنقید کیجائے۔ جو انہوں نے اس زمانہ میں عملی کی۔ تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ مگر ہم صرف یہی کہنے پر اکتفا کرینگے۔ کہ انکی اڈیٹری کے زمانہ میں اخبار مذکور کی اشاعت چالیس ہزار سے ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ وہ تقریباً تین سال تک اخبار مذکور کے اڈیٹر رہے یہ زمانہ اٹلی کے لئے نہایت آزمائشوں کا تھا۔ ملک میں جابجا ہڑتالیں ہوتی تھیں اور امن کہیں نام کو نہ تھا۔

۱۹۱۴ء میں اخبار مذکور کے علاوہ انہوں نے اپنا ایک اور رسالہ یوٹوپیا کے نام سے جاری کرکے اپنی پارٹی کے اغراض و مقاصد اور اصولوں پر فلسفیانہ تنقید شروع کی جس سے انکی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ انہوں نے لوگوں کی ترقی کے متعلق مضمون لکھے اور بتایا کہ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے مستقل اصولوں پر کاربند ہونا چاہیئے۔ وہ انہی باتوں میں مصروف تھے۔ کہ جنگ عظیم کی خوفناک آگ بھڑک اٹھی۔

اسوقت ملک کی حالت ناقابل بیان تھی۔ عوام کا خیال تھا کہ اٹلی کو باوجود جرمنی اور آسٹریا کا حلیف ہونے کے انکا ساتھ نہیں دینا چاہیئے۔ برعکس اسکے لوگ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ کہ فرانس کی طرفداری کی جائے۔ مسولینی کی اپنی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ ہر سال کہتے۔ کہ جب انہوں نے ترکی کے ساتھ لڑائی کی مخالفت کی تھی۔ تو اب کس منہ سے وہ لڑائی کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ ملک کی آنکھیں اڈیٹر "اونتی" کی طرف

لگی ہوئی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔ مگر اخبار کی پالیسی یہی رہی کہ لڑائی میں نہ کودا جائے۔

حالات و واقعات پڑھنے پر انہوں نے لکھا... کہ اٹلی کو لڑائی میں شامل ہونا چاہئے۔ سوشلسٹ پارٹی متفقہ طور پر انکے خلاف ہوگئی۔ اور ان کو بہت بری طرح پارٹی سے نکالا گیا۔

اس حالت میں بھی وہ بددل نہ ہوئے۔ اور پیشین گوئی کے طور پر کہا "آج تم نے میرے خلاف ہو کر مجھے نکال دیا ہے۔ اور میری بے عزتی کی ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں جب عوام میری پیروی کرنا فخر اور باعث عزت خیال کرینگے۔"

جب وہ پارٹی سے نکالے گئے۔ تو قدرتی طور پر انہیں اڈیٹری کی اسامی سے بھی برخاست کر دیا گیا۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ کہ انہوں نے برخاستگی پر کئی مہینوں کی تنخواہ جو اخبار مذکور کے ذمہ واجب الادا تھی۔ لینے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ بونس بھی نہ لیا۔ جسکے وہ مستحق تھے۔

برخاستگی کے تین ہفتے کے اندر اندر انہوں نے "پیپل آف اٹلی" کے نام سے ایک اخبار کا اجرا کیا۔ اخبار نے چند مہینوں کے اندر اندر وہ ترقی کی۔ کہ حکومت انکی ہر آواز پر لبیک کہنے پر مجبور ہوگئی۔ اور ان کے مشوروں سے مستفید ہونا ملک کیلئے انہیں ضروری سمجھنے لگی۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب انہوں نے حالات پر غور کرکے اپنا تعلق فسطائیت سے قائم کر لیا تھا۔ اور علی الاعلان کہہ دیا تھا۔ کہ فسطائیت ملک کے لئے بہترین

چیز ہے۔

ان کے اخبار کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا۔ وہ حکومت میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس لئے حکومت نے مئی ۱۹۱۵ء میں ان کی رائے سے متاثر ہو کر شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔

سوشلسٹ لڑائی کے خلاف تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو بھرتی ہونے سے منع کرتے اس لئے مسولینی نے بذاتِ خود نوجوانوں میں تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ یونیورسٹیوں میں جاتے فسطائیت کے اصولوں پر لیکچر دیتے۔ اور لڑائی کے لئے نوجوانوں کو بھرتی کرتے وہ خود بطور سپاہی بھرتی ہو کر میدان کارزار میں پہنچے۔ اور اسطرح لڑے کہ ہر طرف انہیں کا نام لیا جانے لگا۔ مگر انکی گذشتہ زندگی کے واقعات کی بنا پر افسر انکے لئے کمیشن کی سفارش کرنے سے احتراز کرتے۔ ۲۳ فروری ۱۹۱۷ء کو وہ ایک خندق میں تھے۔ کہ ایک بم پھٹ کر کئی سپاہیوں کی ہلاکت کا باعث ہوا۔ وہ بہت بری طرح زخمی ہوئے۔ مگر ڈاکٹروں کی جانفشانی سے انکی جان بچ گئی۔ بم کے سینتالیس ٹکڑے ان کے جسم سے نکالے گئے۔

آسٹریوں نے اس ہسپتال پر جس میں وہ صاحب فراش تھے۔ گولہ باری کی اور ایک حصہ ہسپتال کو منہدم کر ڈالا۔ انکی حالت اس قدر نازک تھی۔ کہ وہ ہسپتال سے نکالے بھی نہ جا سکتے تھے۔ ان ایام میں اٹلی کے بادشاہ سپاہیوں کی دلجوئی کے لئے اس ہسپتال میں گئے۔ اور چند منٹ مسولینی سے باتیں کرتے رہے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ مسولینی حضور شاہ

میں باریاب ہوئے۔ اور دوسری دفعہ جب وہ ملک معظم سے ملے۔ تو یہ وہ وقت تھا کہ وہ بطور وزیر اعظم بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ چونکہ وہ فوجی خدمات کے لائق نہ رہے تھے۔ اس لئے انہیں فوج سے علیحدہ کر دیا گیا۔

صحت یاب ہونے کے بعد اُنہوں نے "پیپل آف اٹلی" کی ادارت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس دوران میں انہوں نے لڑائی پر نہایت عمدہ مقالے لکھے اور عوام کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کر کے لڑائی کی طرف انکی توجہ کو منعطف کرایا۔

اگرچہ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی مگر اٹلی نے محسوس کیا کہ لوگوں کے افلاس کی کیا حالت ہے۔ اٹلی کے تمام ذرائع ختم ہو چکے تھے۔ . . . .

. . . . ہر طرف مایوسی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ فوجی تنخواہیں مانگنے پر مصر تھے۔ مگر خزانے بالکل خالی تھے۔ ہر وقت یہ خطرہ دامنگیر تھا۔ کہ ملک میں خانہ جنگیاں نہ شروع ہو جائیں۔ جا بجا ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ اشتراکیت کی مثال لوگوں کے پیش نظر تھی۔ اور عوام اسکی تفصیلات سے ناواقف تھے۔ عام قاعدہ ہے۔ کہ جب کسی کو کسی بُری چیز سے منع کیا جائے۔ تو اسکی طبیعت اس کی طرف زیادہ راغب ہو جاتی ہے۔ اور اٹلی کے لوگ اس سے کلیتہً متنفر نہ تھے۔ ہڑتالوں سے بلوے۔ بلوؤں سے لوٹ اور لوٹ سے قتل و غارت کا میدان گرم ہو گیا۔ لوگوں میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا۔ کہ جنگ عظیم کا معاوضہ اٹلی کو نہیں ملا۔ وہ خیال کرنے لگے۔ کہ انکی قربانیاں نظر انداز کی گئی ہیں۔ انکی آنکھوں میں دھول ڈالی گئی ہے۔ لوگوں کے خیالات حکومت کے

متعلق بہت بُرے تھے۔ اور عوام کا خیال تھا کہ عنانِ حکومت نہایت کمزور انسانوں کے ہاتھ میں ہے۔

پیٹنی ملک کی حالت۔ جب ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو پہلی فاسینٹ مجلس باقاعدہ طور پر "پیپل آف اٹلی" کے دفتر میں قائم کی گئی۔ فاسینٹ کے نشان تیشہ اور ڈنڈا ہیں تیشہ سے مطلب ان لوگوں کی سرکوبی ہے جو امن عامہ میں خلل انداز ہوں۔ ڈنڈا سے مطلب بیگناہوں بیکسوں کو ظلم دلندی سے بچانا ہے۔ فاسینٹ کا مطلب یہ ہے۔ کہ ملک کو فرانس کیطرح تباہ کن انقلابوں سے بچاکر راہ راست پر لایا جائے۔

ہم نے دکھلایا ہے۔ کہ مسولینی کی تعلیم و تربیت کس طور پر ہوئی۔ وہ نپولین کی طرح انقلابی بچہ نہیں تھا۔ بلکہ مجسم انقلاب تھا۔ مسولینی کو خود اعتراف ہے۔ کہ اِن کی تعلیم و تربیت سینیکا وہ نہایت مضبوطی کے ساتھ ارسطو کے اصول کے قائل ہیں کہ لوگوں کی فطرت ایک ہے۔ غلام اور آقا قدرت کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ اثر پذیری کا نتیجہ ہیں فاسیت تمام ملکوں کے عمدہ اصولوں کا مجموعہ ہے۔ فاسیت کے معتقدین کا یہ دعوٰے ہے۔ کہ اٹلی کی سی اقتصادی آزادی کہیں نہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ اقتصادی امور کو پولیٹیکل امور پر ترجیح دیجاتی ہے۔ لارڈ کپرس اپنی کتاب "ریسینٹ ڈیموکریسی ان ٹرائیل" "RECENT DemocracyonTrial" میں لکھتے ہیں۔ ایسی عمدہ اقتصادی حالت دنیا میں کہیں نہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ فاسیت کے اصول فرانسی ماہرین اقتصادیات اور پولیٹیکل مدبروں کے دماغوں کا نتیجہ ہیں۔ مگر لفظ اٹیلین ہے۔ فاسینٹ کے اصول

کی بنا۔ وہی اصولوں پر ہے۔ فاسیت کے معنی نشوونما پانا ہے۔ جس طرح انسانی جسم میں دماغ اور سب اعضاء نشوونما پاتے ہیں۔ اسی طرح ملک میں بلالحاظ رنگ و نسل امارت وغربت لوگ ترقی کے مدارج طے کر کے معراج تک پہنچتے ہیں۔ اور اسی کا نام فاسیت ہے۔

پہلی فاسیت پارٹی ان فوجیوں کی تھی۔ جو لڑائی کے بعد فوجوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ یا تو وہ بہت بوڑھے تھے یا بہت نو عمر۔ ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔ کہ ہر خیال کے لوگ اس میں شامل تھے۔ میدان سے یہ تحریک تمام ملک میں پھیل گئی۔ اگرچہ تحریک روز بروز پھیل رہی تھی۔ مگر فاسیت پارٹی عام انتخابات میں ایک نشست پر بھی قبضہ نہ کر سکی حتیٰ کہ مسولینی کو بذاتِ خود شکست ہوئی ۱۹۲۰ء میں ایک بہت بڑی ہڑتال ہوئی جس میں فاسیت پارٹی نے نمایاں حصہ لیا۔ پھر انہوں نے ایک فیکٹری پر قبضہ جما لیا۔ اور حکومت نے ان کے رویہ کو جائز قرار دے دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے جابجا ملک کی فیکٹریوں پر قبضہ کر لیا۔ ملک کی حالت دن بدن ابتر ہونے لگی۔ نیٹی وزیر اعظم کا خیال تھا کہ کمیونسٹ اور فاسسٹ آپس میں لڑ بھڑ کر ختم ہو جائیں گے۔ مگر اسکا قیافہ درست نہ نکلا۔ فاسیت دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہے تھے۔ ان کی پارٹی ہر وقت زور پکڑ رہی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں باقاعدہ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اور ایک میونسپل کمشنر کو ٹاؤن ہال میں قتل کیا گیا۔ میدان میں بیس آدمی ہلاک اور دو سو زخمی ہوئے۔ مسولینی اور ان کی پارٹی اکثر کشت و خون روکنے کی کوشش کرتے حتیٰ کہ ۱۹۲۱ء کے عام انتخابات میں فاسیت کے ۳۵ ممبر پارلیمنٹ

میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئے۔ ان کامیاب ممبروں میں مسولینی بھی تھے۔ ملک کی حالت ابتر تھی۔ اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ شخص جو امن قائم رکھنے میں کامیاب ہوگا۔ اصل معنوں میں ملک کا سردار تصور کیا جائیگا۔ ملک اسکے بس میں ہوگا اور اسی کی حکومت تصور ہوگی۔

مئی ۱۹۲۱ء میں حکومت کیخلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس ہوا۔ اس لئے عام الیکشن لازمی تھا۔ فکٹا وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ مگر دو ماہ کے اندر اندر پھر وہی لیل و نہار آ گئے۔ کشت و خون کا سلسلہ جاری رہا یہ وہ وقت تھا جب مسولینی نے واقعات پر قابو پا کر اہل ملک کو بیانگ دہل بتلا دیا کہ صرف مسولینی ہی ایک ایسے شخص ہیں جن کا اقتدار ملک میں امن قائم رکھ سکتا ہے۔ مسولینی نے وزیر اعظم کو مشورہ دیا۔ کہ وہ پھر الیکشن کروالیں۔ مگر انہیں یہ رائے پسند نہ آئی۔ اڈین میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مسولینی نے ایک نہایت موثر تقریر کی جس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ وہ امن کے خواہاں ہیں۔ اور امن محض بادشاہ کے دم سے برقرار رہ سکتا ہے۔ انہوں نے جتلا دیا کہ کمیونسٹ سراسر تباہی اور بربادی کا مجمع ہیں۔ اور راحت اور امن محض بادشاہت سے مل سکتی ہے۔ ملک اور تمام افسروں کو ان کی رائے بہت پسند آئی سب نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ ان کا زور روز بروز بڑھنے لگا۔ انہوں نے ایک مخفی انقلاب کی تجویز گھڑائی۔ آہستہ آہستہ تمام شہر پر فاسیت پارٹی کا قبضہ ہونے لگا۔

آخر کار ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو فاسیت پارٹی نے دارالخلافہ روم پر اپنا قبضہ جما لیا۔

وزیر اعظم فکٹا حیران رہ گئے۔ انکا خیال تھا کہ مسولینی اور ان کے ہمراہیوں کی حراست عمل میں لائی جائے۔ مگر اس کے لئے بادشاہ کی منظوری لازمی امر تھی۔ وہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ مسولینی کی حراست اور مارشل لاء کے نفاذ کی درخواست کی مگر بادشاہ نے دونوں باتوں سے انکار کر دیا۔

بادشاہ ذی ہوش اور معاملہ فہم انسان تھے۔ ملکی ضروریات کو وزیر سے بہتر سمجھتے انہوں نے نئی فاسیسٹ پارٹی کو وزارت بنانے کا حکم دیا۔ بادشاہ کے سیکرٹری نے مسولینی کو جو اسوقت میلان میں تھے۔ بذریعہ ٹیلیفون پیغام بھیجا۔ کہ حضور نے قلمدان وزارت آپ کے سپرد کرکے روما میں بلایا ہے۔ مسولینی نے عرض کی اس خبر کی تصدیق بذریعہ اخبار کیجائے۔ اور وہ اسی وقت روما پہنچے۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ فاسیسٹ پارٹی شہر پہ قبضہ جما لیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ کہ مسولینی کو ان کی وزارت پر افسروں نے مبارکباد کے تار دئیے۔ جس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ ماتحت افسروں کو پولیٹیکل معاملوں میں مبارکباد کے تار دینا منع ہے۔ اور آئیندہ ایسی حرکت کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔

قدرتی طور پر ایک متجسس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا مسولینی کے بغیر اٹلی میں فاسیسٹ پارٹی کی کامیابی ممکن تھی۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ناممکن تھی ان کے بغیر اٹلی قطعی طور پر خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتا۔ اور اس کی حالت آج سپین کی سی ہوتی۔

قلمدان وزارت سنبھالنے کے بعد انہوں نے حکم دیا کہ فاسسٹ پارٹی کے سب آدمی بادشاہ کے حضور میں عقیدت کے پھول پیش کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو سدھاریں۔ اگر بعض لوگ اس حکم سے مطمئن نہ تھے۔ مگر کسی کی جرأت نہ تھی کہ حکم عدولی کرتا۔ اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ فضاء میں امن قائم ہو گیا۔ بدامنی کا خدشہ جاتا رہا۔ انہوں نے اتنی عقلمندی سے کابینہ وزارت مرتب کی کہ سب حیران رہ گئے۔ انہوں نے پرانے اصولوں کو منسوخ کر کے انکی جگہ نئے اصول وضع کئے۔

ان کی کامیابی کا راز علاوہ دیگر رازوں کے اس امر میں مضمر ہے۔ کہ فصاحت و بلاغت ان کے گھر کی غلام ہے۔ اہل اطالیہ فطرتاً لمبے لمبے خطبوں کے عادی تھے۔ مگر مسولینی نے اسکے برعکس مختصر اور خاص موضوع کے متعلق کہنا شروع کیا۔ وہ کبھی ایسے دعوے نہ کرتے جو کبھی پورے نہ ہو سکتے۔

قلمدان وزارت سنبھالنے کے بعد انہوں نے کہا کہ مجھے پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ میں پارلیمنٹ کے پروگرام کو وضع کروں۔ اسوقت پروگرام کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ عملی کام کرنے والے آدمیوں کی ہے۔ پروگرام کی تجاویز کے کاغذات سے الماریاں بھری ہوئی ہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ میں مشاورت کا قائل ہوں۔

پارلیمنٹ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ کہ اسکی زندگی زیادہ سے زیادہ تین سال ہے۔ اس لئے وہ کام کرنے چاہیئیں۔ جو ملک اور قوم کے لئے مفید ہوں۔ حضرات میں محض لفاظی سے آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ ملک و ملت کیلئے ٹھوس کام کر کے

دکھانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ میں آئین اور قانون کی فرمانبرداری اپنا ایمان سمجھتا ہوں لیکن ملکی تنظیم کو ان دونوں سے زیادہ افضل سمجھتا ہوں۔

۱۸۴۸ء سے اکبر مسولینی کے تقرر تک اٹلی کا آئینی دستور العمل بغیر کسی تبدیلی کے ویسا رہا۔ جو شروع میں قائم ہوا تھا۔ زمانہ کے تغیر و تبدل کا تقاضہ تھا کہ اس میں رد و بدل کیا جاتا۔ مگر کسی شخص کو حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ ایسے اہم کام کو ہاتھ میں لیتا۔ اگر ان تمام اصلاحات کے بارے میں جو انہوں نے کیں لکھا جائے۔ تو ایک دفتر درکار ہے۔ اٹلی کا عام انتخابات دراصل قوم کا متحدہ فیصلہ ہے کہ آیا وہ بادشاہت کو پسند کرتی ہے یا نہیں مجلس قانون ساز مسولینی کے دماغ کا بہترین نتیجہ ہے۔ جو گذشتہ تیس سال کے تجارب کے بعد انہوں نے حاصل کیا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اگرچہ مسولینی ملک کے ڈکٹیٹر ہیں۔ مگر وہ جنرل پریمو اور زنگولا کی طرح مطلق العنان ڈکٹیٹر نہیں۔ ان کے تمام اختیارات اور ہر فعل مجلس واضع قانون ساز کا منظور شدہ ہے۔ قوم متفقہ طور پر ان کے پیچھے ہے۔ ان کی مثال بعینہٖ ہنری ہشتم کی سی ہے۔ اسے پارلیمنٹ نے پورے اختیار دے دیے تھے۔ کہ جو وہ چاہے کرے۔

انہوں نے رشوت کا قطعی طور پر خاتمہ کر ڈالا ہے۔ عفوان کے نزدیک گناہ ہے وہ ہمیشہ گنہگار کو سخت سے سخت سزا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ لوگوں کا روپیہ ایک مقدس امانت ہے۔ اور خائن کو بخش دینا خود جرم کا ارتکاب کرنا ہے۔ میونسپلٹیوں کے مجرموں کے لئے نہایت سنگین سزائیں مقرر کر

رکھی ہیں۔ انکا قول ہے کہ قومی روپیہ رکھنے والے لوگ شک و شبہ سے بالا ہونے چاہئیں اور وہ محض شک کی بنا پر معزز عہدیداروں کو انکے عہدوں سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حکام کا فرض ہے۔ کہ وہ لوگوں کے اخلاق کی نگرانی کریں۔ لوگوں کو راہ راست پر لائیں اور باعزت زندگی بسر کرنے کا موقعہ دیں۔ انکا خیال ہے۔ کہ حکومت ٹیکس جمع کرنیکی مشین نہیں ہے۔ بلکہ لوگوں کو سہولت کی زندگی بسر کرنے کا سامان بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔

اس اثناء میں دوسرے ملکوں کی آنکھیں اٹلی کیطرف لگی ہوئی تھیں۔ بیرونی طاقتیں یہ خیال کرتی تھیں۔ کہ اٹلی کا کچھ مرغانہ جنگجوں سے نکل جائیگا۔ اور مسولینی کے وزیر اعظم ہونے تک انکا یہی خیال رہا۔ ۱۹۲۳ء میں مسولینی نے کہا "اگرچہ ہم صلح کل ہونا چاہتے ہیں۔ مگر اسکا مدعا یہ نہیں کہ ہم خودکشی کی پالیسی اختیار کریں۔ دیگر ممالک کے بارے میں میری پالیسی نہیں ہوگی جو محض ہوس پر مبنی ہو۔ ہم دیگر ممالک کے حصوں پر قبضہ نہیں جمانا چاہتے۔ مجھے فطرتاً یہ برا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے ملک کو دوسرے لوگوں کے ملکوں پر قبضہ کر کے وسیع کیا جائے۔

مسولینی فرانسیسی اور جرمنی زبان پر اپنی مادری زبان اٹلی کیطرح قادر ہیں۔ انگریزی میں وہ خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ ہسپانوی اور ڈچ سے وہ بے بہرہ نہیں ہیں۔ وہ اپنے وطنی بزرگوں کی فطرت سے خوب واقف ہیں۔ اور یورپ کے مدبرین کی چالوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ چونکہ مسولینی سوسائٹی کے ہر طبقہ میں رہے ہیں۔ اس لئے فطرت انسانی کے بہت ماہر ہیں۔ انگریزی صحافت کی شطرنجی چالوں کو اس طور پر سمجھتے ہیں۔ جس طرح ایک کاریگر دھبے

کاریگری کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوتا ہے"

وہ ہر روز انگریزی اخباروں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اپنی ڈائری میں ان کے متعلق اقتباسات لکھتے رہتے ہیں۔

معاہدوں کے متعلق انکا خیال ہے۔ کہ نہ وہ ایسے ہیں جو دیر تک قائم رہیں۔ اور نہ ایسے ہیں۔ کہ ان میں تبدیلی نہ ہو سکے۔ معاہدے ایک قسم کی تاریخ ہیں۔ وہ اس فرانسیسی خیال کے ساتھ ہیں۔ کہ عہد نامے پر ہمیشہ کے لئے کاربند ہونا ضروری ہے۔

مسولینی اپنی زیادہ توجہ ان ملکوں کی طرف منعطف رکھتے ہیں۔ جو بحیرۂ روم کے کنارے کنارے واقعہ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اٹلی کے لئے بحیرۂ روم کے ممالک بیحد مفید ہیں۔ اٹلی سے باہر جانے کا راستہ بحیرۂ روم ہے۔ اٹلی کی جتنی تجارت اور دلچسپی امریکہ سے ہے اتنی کسی ملک سے نہیں ہے۔ اس نظریہ سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی بحری طاقت مضبوط کرنے کے لئے سخت جانفشانی کی ہے۔

غالباً تمام دنیا میں مسولینی واحد شخصیت ہے۔ جو روسی لیڈروں سے بذات خود واقف ہے۔ اور اٹلی واحد ملک ہے جہاں روسیوں کی خفیہ سازشوں کیخلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کیجاتی۔ فاسیت کے برسر اقتدار ہونے پر روس کی تھرڈ انٹرنیشنل (Third International) نے تمام پرچار اٹلی میں بند کر دیا۔ اور آج تک کوئی تبلیغ اپنے اصول کی اٹلی میں نہیں کی۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی معاہدے ہیں۔ جن کی رُو سے اٹلی کی تجارت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ وہ اپنے ملک کی تجارت میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ اور باوجود

اتنی مصروفیتوں کے اس غرض سے دو دفعہ امریکہ اور دو دفعہ اس علاقہ میں جو آسٹریا سے فتح کیا تھا۔ وہ دورہ کر چکے ہیں۔

مزدور کو سرمایہ دار کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے بچانے کے لئے انہوں نے عجیب و غریب قانون بنا رکھے ہیں۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لئے علیحدہ عدالتیں ہیں کہ کوئی مزدور اپنے کام سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جب تک مزدور عدالت حکم نافذ نہ کرے۔

وہ بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ اٹلی جنگ کا خواہاں نہیں مگر کھلی ہوا کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا اگر اٹلی کو اپنی بقا کے لئے جنگ کرنی پڑی۔ تو وہ مجبور ہوگا۔ اور ہر حالت میں اپنی بقا کے لئے تگ و دو کریگا۔ کانفرنسیں محض تضیع اوقات کا ذریعہ ہیں۔ اٹلی اپنے گھر کی تنظیم و ترتیب بغیر کانفرنسوں کے کرنا چاہتا ہے۔

مسولینی کی اپنی فوجیں ہیں جو ہر وقت ان کے لئے مرنے کو تیار ہیں۔ وہ فوج میں نہایت ہر دلعزیز ہیں۔ اور ہر سپاہی ان کو بمنزلہ باپ کے سمجھتا ہے۔ ان کی فوج کے سپاہی ان کو ڈوچ کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں جو غالباً ڈیوک کا مترادف ہے۔ انکا خیال ہے کہ فوج کو اندرونی معاملات میں قطعاً دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ فوج کا کام صرف بیرونی لڑائیاں لڑنا ہے۔ اور ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ سنگینیں اور پستول اس لئے نہیں ہیں کہ ان سے ملک کے بچوں کی پسلیاں توڑی جائیں۔ اندرونی معاملات پولیس کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔ ورنہ اٹلی کی بھی وہی حالت ہوگی جو آج سپین کی ہے۔

وہ موجودہ یوروپین خیال کے خلاف ہیں کہ انسانی پیدائش کو روکا جائے۔ وہ اس امر کے خواہاں ہیں کہ ملک کی آبادی حد سے زیادہ بڑھے۔ ان کے خیال میں کسی قوم کی قسمت اس کی آبادی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ وہ ایشیائی خیال کے قائل ہیں کہ خدا وند تعالے ہر حالت میں انسان کو خوراک پہنچاتا ہے۔ اور انسان کا روزینہ اسکی پیدائش سے ہی مقدر ہو جاتا ہے۔ تعداد کے لحاظ سے بڑے خاندان میں ایک خداداد ذہین کا پیدا ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ مشاہدہ کی بنا پر دیکھا گیا ہے کہ بیویں صدی کی یہ دلیل کہ اولاد اتنی ہونی چاہیئے جسکی اچھی طرح تعلیم و تربیت ہو سکے محض لفاظی ہے۔ لیسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ غریب الدین کے بچے اعلےٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اور امراء کے لڑکے جنہیں تمام وسایل مہیا ہوتے ہیں محض جاہل اور کندہ ناتراش رہتے ہیں۔

مسولینی نے تمام اضلاع کی صحت کیطرف پوری توجہ دی ہے۔ آج اٹلی میں کوئی گاؤں ایسا نہیں جہاں پانی کے نکاس کے لئے بدر روئیں اور اچھی سڑکیں نہ ہوں۔ گاؤں گاؤں میں سرکاری باغات کتب خانے تیرنے کے تالاب۔ واٹرورکس اور ہسپتال واقع ہیں گاؤں کے لوگوں کے لئے جمناسٹک ورزش کے کھیلوں میں حصہ لینا ضروری ہے۔

الغرض آج اٹلی دنیا کے بہترین ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا وقار لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ ہے۔ اس کی قدر و منزلت بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ دنیا کی کانفرنسوں میں کوئی مسودہ اس وقت تک پیش نہیں ہوتا۔ جب تک اٹلی اس میں شمولیت نہ کرلے۔ آنے والی نسلیں مسولینی کا نام تعظیم و تکریم سے لیں گی اور سچ تو یہ ہے۔

کہ جب تاریخ کا طالب علم تاریخ اطالیہ کی ورق گردانی کرے گا۔ تو مسولینی کے نام کے آتے ہی ادب واحترام سے کھڑا ہو جائے گا۔

لینن

ملک روس میں دریائے والگا کے کنارے ایک شہر ہے جس کا نام سمبرسک ہے۔ اس شہر کی قسمت میں لکھا تھا کہ بیسویں صدی کا مشہور و معروف انقلابی آدمی وہاں پیدا ہو کر دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم رد و بدل کرے۔ زار روس جسکا نام سنتے ہی دنیا کے بڑے بڑے آدمی تھرا جاتے تھے۔ اُس کے ہاتھ سے نیست و نابود ہو اور وہ ایک ایسی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو جس کے اصول ساری دنیا سے جداگانہ ہوں۔ اس گاؤں میں ۱۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو ایک نہایت معزز اور شریف باپ کے ہاں یہ بچہ پیدا ہوا جسکا نام والڈمیر لینن رکھا گیا۔ لینن کے والد حکومت کی طرف سے مشیر تھے۔ اور اس عہدہ کے علاوہ نیشنل اسکول کے مہتمم اعلےٰ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ لینن کے بڑے بھائی کا نام الیگزینڈر تھا۔ لینن شہر کے گرامر اسکول میں تعلیم پاتے تھے۔ اُنکا سن سترہ سال کا تھا۔ وہ انٹرنس میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے بھائی کے زیر اثر تمام انقلابی کتابوں سے واقفیت حاصل کر لی تھی صبح کے ناشتہ کے بعد شام تک ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ انقلابی رسائل کتابیں اور دیگر لٹریچر کے مطالعہ میں منہمک رہتے۔ انہیں کتابیں پڑھنے سے خاص شغف تھا۔ اور جب وہ سائبیریا میں جلاوطن کیے گئے۔ تو اکثر وقت مطالعہ میں ہی گذارتے تھے۔

وہ اپنے بھائی الیگزینڈر کے نقش قدم پر چلنا باعثِ فخر سمجھتے۔ ہر بات میں

اسکی تقلید اپنے لئے نجات کا ذریعہ خیال کرتے۔ مارکس کی کتاب کا پٹیں انگیزنڈر کی
تحریک سے لینن نے پڑھی۔ دونوں بھائی گھنٹوں کتاب پر تنقید کرتے۔ اور شہر میں مارکس
کے اصولوں کی اشاعت کو کار ثواب سمجھتے۔

الیگزنڈر ایک خفیہ انقلابی پارٹی کے ممبر تھے۔ ۱۸۸۷ء میں ان کی پارٹی نے زار الیگزنڈر
دوئم کو ہلاک کر دینے کی خفیہ سازش کی۔ یہ طے پایا کہ الیگزنڈر کو زار کے قتل کے لئے
متعین کیا جائے۔ پیٹرزبرگ میں زار پر بم پھینکا جائے۔ اور اس طور پر ظلم و تعدی کا ہمیشہ
کے لئے استیصال کر دیا جائے۔ مگر انہیں کیا معلوم تھا سے

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

سازش کا راز طشت از بام ہو گیا اور تمام کی تمام پارٹی گرفتار کر لی گئی۔ لینن کے
بھائی الیگزنڈر اور اُن کے چار رفقاء کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی۔ لینن اسوقت
طالب علم تھے۔ اور بھائی کے قتل کا اُن کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے اسوقت سے
تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے ملک کو زار کے استبداد سے رہائی دلانے کے لئے ہر ممکن کوشش
کرینگے۔

لینن بیان کرتے ہیں کہ اسوقت ملک کی حالت اس قعر مذلت میں گر چکی تھی کہ لوگ
بادشاہ کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا بھی گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ پھانسی سے قبل جب ان کی
والدہ اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے سیمبرسک سے پیٹرزبرگ جانیوالی تھیں۔ تو کوئی شخص
بھی بڑھیا کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ لوگ کہتے کہ قیدی کی والدہ کیساتھ

سفر کرنا بدترین فعل ہے۔ لوگوں کی بزدلی اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ کہ وہ اُن کے خاندان کے کسی فرد سے بات تک کرنا جرم سمجھتے تھے۔

لینن کی بیوی کروپسکیا لکھتی ہیں۔ کہ لینن کو اپنے بھائی سے بہت زیادہ محبت تھی وہ اکثر اپنے بھائی کا تذکرہ مجھ سے کیا کرتے۔ اور اس کے قتل پر محبت کے آنسو بہاتے۔ دونوں بھائیوں کے محسوسات اور خیالات تقریباً ایک جیسے تھے۔ الیگزنڈر کو زار کی حکومت سے سخت نفرت تھی۔ وہ اپنی موت کے بعد تمام جذبات ورثتاً لینن کے لئے چھوڑ گیا

گرامر اسکول کی تعلیم کی تکمیل پر لینن میٹرک کے لئے کازان یونیورسٹی میں داخل ہوئے اس اثناء میں ان کے عقاید مارکس کی تقلید میں پختہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے کازان یونیورسٹی کے طلباء کی انقلابی مجلس میں شرکت کی۔ مگر انہیں اس جرم کی پاداش میں دار العلوم سے نکال دیا گیا۔ اور جلا وطن کر کے کاشینو بھیج دیا گیا۔

۱۸۹۰ء میں کاشینو میں سخت قحط برپا ہوا۔ وہاں امدادی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ایک انجمن کے جلسہ میں امداد کے لئے تقریریں ہو رہی تھیں۔ لینن وہاں موجود تھے۔ وہ بغور تقریریں کو سنتے رہے۔ مگر وہ زیادہ دیر تک اپنے جذبات کو دبا نہ سکے۔ پلیٹ فارم پر آکر کہنے لگے کہ یہ تمام امدادی انجمنیں فضول اور بیکار ہیں۔ لوگوں کے اضطراب کی وجہ حکومت کا ظلم ہے ان خیالات کی وجہ سے انہیں وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ کچھ عرصہ تک ہراساں و پریشاں پھرنے کے بعد وہ پیٹرزبرگ پہنچے۔ اور از سرِ نو بیرسٹری میں داخل ہو کر امتحان پاس کرتے ہیں، کامیاب ہو گئے۔

پیٹرزبرگ میں انہوں نے پریکٹس شروع کی۔ مگر اس جوشیلی طبیعت کو اس پیشے میں کیسے سکون حاصل ہو سکتا تھا۔ ایک سال کی پریکٹس کے بعد انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ آئندہ زندگی کے لئے محض انقلابی پروپیگنڈے کو اپنا مشغلہ بنائیں گے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی انہوں نے بیرسٹری کو ہمیشہ کے سلئے خیرباد کہہ دیا۔ زنافت اپنی کتاب "لینن" میں رقمطراز ہے کہ جب لینن بیرسٹری کے تجربے مجھ سے بیان کرتے۔ تو میں ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جاتا ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۳ء تک انہوں نے روس کے مختلف شہروں اور قصبوں میں سفر کیا وہ اکثر احتیاط سے اپنے خیالات کی اشاعت کرتے۔ انہیں عموماً جستجو رہتی تھی۔ کہ کسی طور پر انہیں اپنے ہم خیال مل جائیں۔ تاکہ وہ مارکس کے اصولوں کی اشاعت کر سکیں۔ اکثر انقلابی لوگوں کو ان کے لائحہ عمل سے اختلاف ہوتا۔ اور وہ انہیں فضول قرار دے کر پہنچ ہی کر لیتے معترضین کہتے۔ کہ روس کے عوام نیم بیدار ہیں۔ اس سلئے مارکس کے اصولوں اور اغراض و مقاصد کی کامیابی ناممکن العمل ہے۔ لینن اعتراضوں کی قطعاً پروا نہ کرتے اور آہستہ آہستہ اپنے اصولوں کو لوگوں پر واضح کرنا اپنے مشن کا اولیں مقصد سمجھتے۔

لینن کی بڑائی اسی راز میں مضمر تھی۔ کہ وہ ایک مٹھے ہوس کام کرنے والے شخص تھے۔ وہ سمجھ چکے تھے۔ کہ کسانوں اور مزدوروں میں کام کرنا کامیابی کی کلید ہے۔ وہ خوب جانتے تھے۔ کہ جب تک کسانوں اور مزدوروں میں کام کرنے والی پارٹی پیدا نہیں کرتے انہیں کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ وہ تاڑ گئے تھے۔ کہ بڑے بڑے جلسوں میں تقریروں سے وہ مطلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کو قائل کرنے سے ہوتا ہے۔

لینن اکثر فیکٹریوں میں جاتے مزدوروں سے تبادلہ خیالات کرتے۔ اپنی کہتے ان کی سنتے مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دیتے۔ سرِ دھنتے اور پکار پکار کر انہیں سمجھاتے۔

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بالآخر مزدوروں پر اُن کی تقریروں کا اثر ہونا شروع ہو گیا۔ وہ جب مزدور اور کسان کی مفلسی و بے کسی اور حکومت کے ظلم بیان کرتے۔ تو سامعین کے دلوں پر چوٹ سی لگتی اور یہ تقریریں آگ پر تیل کا کام دیتیں۔

انہوں نے لوگوں کی اقتصادی حالت پر پمفلٹ لکھے۔ وہ لوگوں کو سمجھاتے کہ مزدور اور کسان کا گلا گھونٹنے کا نام زار کی حکومت ہے اور کہتے

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

اور نہایت غور و خوض کے بعد اس بیماری کا صرف یہی علاج تجویز کرتے

انقلاب! انقلاب! انقلاب!!!

الغرض ان ذرائع سے لینن کو بڑی کامیابی ہوئی۔ ایک انجمن "آزادیٔ غربا و مزدوران" کی بنیاد پیٹرزبرگ میں رکھنے میں وہ کامیاب ہو گئے تھے۔ اس انجمن کے معرضِ وجود میں آتے ہی جا بجا ہڑتالیں ہونے لگیں۔ جو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۷ء کے ہیبتناک انقلابوں کا پیش خیمہ تھیں اسجگہ لینن کی بیوی کروپسکیا کا بیان نقل کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ وہ لکھتی ہیں "لینن ۱۸۹۳ء کے موسمِ بہار میں پیٹرزبرگ وارد ہوئے۔ میرا تعارف سال کے آخر میں ان سے ہوا۔ عام طور پر مشہور تھا۔ کہ مارکس کا ایک پیرو صوبہ والگا کا باشندہ شہر میں آ گیا ہے۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کہ اس نو وارد سے تبادلۂ خیالات کروں۔ پہلی دفعہ میں اُن سے ایک تقریب کے موقعہ پر ملی وہ خاموش تھے۔ مگر ان کی آنکھ کا اضطراب اُن کی ذہانت کا پتہ دیتا تھا۔ اور حاضرین کو متاثر کرتا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں میرے تعلقات اُن سے زیادہ مستحکم ہو گئے۔ وہ اس وقت انقلابی پروپیگنڈے میں مصروف تھے۔ اور میں ایک سنڈے اسکول میں معلمہ تھی۔ سب لوگ مزدور اُن کی جماعت کے ممبر تھے۔ میرے اپنے اسکول میں تقریباً چھ سو سے زائد مزدور لکھنے پڑھنے کے لئے آتے۔ استانیوں سے مزدوروں کو اس قدر عقیدت تھی۔ کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں پیٹرزبرگ کے مضافات میں رہتی تھی۔ اور لینن ہر اتوار کو مجھ سے ملنے آتے گھنٹوں گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ مزدور اور کسان کے مصائب کا ذکر کر کے آنسو بہاتے اُن کے معاملات میں انتہائی دلچسپی کا اظہار کرتے وہ کہتے۔ ہمارا فرضِ اولیں ہے۔ کہ دستکاری کرنیوالے لوگوں میں انقلاب پیدا کریں۔ اور انہیں ظلم سے نجات دلائیں۔ وہ "کاپیٹل" سے اکثر حصے مزدوروں کو پڑھ پڑھ کر سناتے حالات و کوائف سے لوگوں میں ہیجان پیدا

کرتے وہ کہتے حکومت کو بدل ڈالنا لوگوں کے اپنے بس کی بات ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر پولیس بڑے غور سے ہماری سوسائٹی کے ممبروں کی جانچ پڑتال رکھتی مگر لینن کی نگرانی ایک اہم کام تھا۔ وہ پیٹرزبرگ کے تمام راستوں کو جانتے تھے۔ سازشی چالوں میں انہیں ملکہ خداداد تھا۔ سوسائٹی کے ممبروں کے انہوں نے علیحدہ علیحدہ نام رکھے تھے۔ اور انہیں ناموں پر اُن سے خط وکتابت کے لئے نقطوں کا طرز املا ایجاد کیا تھا۔ اسی طریقہ کے مطابق آپس میں خط وکتابت کرتے۔ اس سے پولیس کو زیادہ حیرانی ہوتی۔ اور وہ زیادہ کوشش سے ہمارا تعاقب کرتی۔ خدشہ بڑھ گیا۔ اس لئے لینن کی یہ رائے ہوئی۔ کہ کوئی شخص ان کا جانشین مقرر کیا جائے۔ چونکہ میں ان کے طریق کار سے کافی حد تک واقف تھی۔ اور وہ ازراہِ مہربانی مجھ پر زیادہ اعتماد رکھتے۔ اس لئے مجھے انکی جانشینی کا فخر حاصل ہوا۔

لینن بہت بڑے مردم شناس تھے۔ وہ لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فوراً بھانپ لیتے۔ کہ کون کون ان کے لئے کارآمد اور مفید ہو سکتا ہے۔

۱۸۹۵ء میں لینن مزدوروں کے اجلاس میں شمولیت کے لئے برلن گئے۔ وہاں سے وہ سوئٹزرلینڈ پہنچے۔ جہاں ان کی ملک نیو، السرائیڈ اور سلوشش سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہاں سے وہ ایک ایسا صندوق اپنے ساتھ لائے۔ جس کے اندر خفیہ تہ خانہ تھا۔ وہ تمام انقلابی لٹریچر اس تہ خانہ میں محفوظ رکھتے۔

جاسوسوں کے کان میں بھی اسکی بھنک پڑ گئی۔ وہ زیادہ دیکھ بھال کرنے لگے۔ ان کی بیوی قمطراز ہیں۔ کہ میری ایک چچیری بہن محکمہ رجسٹری میں بطور محرر ملازم تھی آدھی رات کو

ایک جاسوس اُن کے پاس آیا۔ اور لینن کا پتہ دریافت کیا۔ جاسوس نے کہا ہمیں خوب معلوم ہے۔ کہ یہ شخص تختۂ حکومت کو الٹنا چاہتا ہے۔ ہمیں نے اس کے بھائی کو پھانسی دلائی تھی۔ اور وہی ریشمی رسہ اب لینن کے گلے کا منتظر ہے۔ میری بہن نے مجھے بصد التجا کہا۔ کہ میں انہیں خطرہ سے آگاہ کر دوں جب میں نے لینن سے اسکا ذکر کیا۔ تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔ جو رات مجھے قبر میں آنی ہے۔ وہ کبھی باہر نہیں آسکتی"۔

پارٹی کے قبضہ میں ایک پریس تھا۔ پولیس کی ان تھک کوششوں کے باوجود یہ پتہ نہیں چلتا تھا۔ کہ وہ کس مقام پر ہے۔ انکی پارٹی روزانہ اخبار جاری کرتی اور وہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر مفت تقسیم کیا جاتا۔ پیٹرزبرگ کی اقامت کے دوران میں لینن نے ایک زبردست پارٹی جمع کر لی تھی۔ مزدوروں اور کسانوں میں اُن کے اصولوں کی اشاعت بہت زیادہ ہو چکی تھی وہ لوگوں میں احساس پیدا کر چکے تھے۔ اور حکومت کیخلاف ایک ہیجان برپا تھا۔ تلاطم خیز موجیں لوگوں کے دلوں سے اُٹھ اُٹھ کر بحر بیکراں کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ آخر کار پولیس نے جو دن رات انکی تلاش میں تھی۔ انکو چند رفقاء کے ساتھ گرفتار کر لیا۔

حراست کے بعد لینن کی پارٹی نے جیل خانہ میں ان سے خط و کتابت کا سلسلہ پیدا کر لیا۔ ان دنوں قیدیوں کو کتابیں جیلخانہ کے اندر بہم پہنچائی جا سکتی تھیں۔ لینن کے رفیق کتابوں کے اندر نقطوں سے جو انہوں نے ایجاد کر رکھے تھے۔ اپنا مفہوم اُن تک پہنچا دیتے۔ لینن اس کے جواب میں اور نقطے ڈال دیتے۔ اور اس طرح سلسلہ پیام جاری رہتا۔ لینن کے پیام سے اُن کے رفیقوں کو تسکین ہوتی۔ اس اثناء میں اُن کی بیوی بھی گرفتار ہو کر جیل میں پہنچ گئیں۔

لینن

کچھ عرصہ کے بعد حکومت نے انہیں رہا کر دیا۔ مگر انکی بیوی ابھی جیل ہی میں تھی۔ جیل سے رہا ہو کر انہوں نے پھر وہی انقلابی پروپیگنڈا نہایت زور شور سے جاری کر دیا جسکی وجہ سے حکومت نے انہیں سائبیریا میں جلاوطن کر دیا۔

جب کروپسکیا جیل سے رہا ہوئیں۔ تو انہوں نے حکومت کے پاس درخواست کی کہ لینن سائبیریا میں ہیں۔ اس لئے انہیں بھی وہاں جانے کی اجازت دی جائے۔ حکومت نے انکی درخواست منظور کر لی۔

لینن کی سائبیریا کی زندگی کے واقعات بیان کرنے کے لئے ہم کروپسکیا کے مرہونِ منت ہیں جنہوں نے تفصیلی طور پر اس داستان کو سپردِ قلم کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ سفر میں میری والدہ میرے ہمراہ تھیں۔ یکم مئی ۱۸۹۸ء کا دن تھا جب ہم نے سفر اختیار کیا شام کو ٹرسک میں ہمیں ایک رشتہ دار ملا۔ جو جلاوطنی میں اپنی زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ اس کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اس نے سوشلسٹ لوگوں سے ہماری ملاقاتیں کرائیں۔ اگلی شام کو ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے لینن گھر پر موجود نہ تھے۔ وہاں کے لوگ فطرتاً بیحد صفائی پسند اور شوقین ہیں ان کے گھر عمدہ خودساختہ قالینوں سے مزین رہتے ہیں۔ لینن وہاں بہت ہر دلعزیز تھے۔ ہمارے پہنچنے کے دو گھنٹہ بعد وہ بھی آموجود ہوئے۔ میرے اور میری والدہ کے لئے دو علیحدہ کمرے مکان سے دئے گئے۔ رات ہم نے باتوں میں کاٹی۔ لینن نے پہلے سے ایک برخاست شدہ ملازم کی مدد کی تھی جو اپنے عہدہ پر بحال کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ان کی قانونی قابلیت کا شہرہ ہو گیا تھا۔ لوگ ان کے پاس مشوروں کے لئے آتے تھے اور

لینن عوام کی ہر طرح امداد کرتے تھے"

جلا وطنی کی حالت میں لینن کو آٹھ روبل وظیفہ ماہانہ ملا کرتا۔ اسوقت ہر ہفتے کی بھی ہفتہ میں ایک دفعہ ان کے لئے بھیڑ ذبح کیجاتی۔ اور ہفتہ بھر وہ اسکا گوشت کھاتے چونکہ صاحب خانہ اکثر مخمور رہتا۔ اس لئے وہ اسکا مکان چھوڑ کر دوسرے میں چلے گئے۔ چار روبل میں ان کو نصف مکان معہ باغ اور ٹینس کورٹ کے مل گیا۔ کروپسکیا اور اسکی ماں گھر کا انتظام کرتیں۔

شام کے وقت لینن کتابوں کا ترجمہ کرتے۔ پمفلٹ لکھتے اور انقلابی اغراض و مقاصد پر تبصرہ کرتے۔ سائبیریا کے اس گاؤں میں جہاں وہ مقیم تھے۔ سوائے شکار اور کتابوں کے انہیں اور کوئی شغل نہ تھا۔ اُن کی بابت عام طور پر مشہور تھا۔ کہ افسانوں سے اُسے وحشت ہوتی ہے۔ مگر کروپسکیا بیان کرتی ہیں۔ کہ یہ محض بے بنیاد بات تھی۔ برعکس اس کے وہ افسانے پڑھنے میں خاصی دلچسپی لیتے۔ گاؤں میں ڈاکیہ دو مرتبہ آتا۔ اور اُن کے دوست پیٹرز برگ سے کتابیں اخبارات اور رسالے کثرت سے ارسال کرتے رہتے۔ لینن کی ماں اُنہیں نہایت باقاعدگی سے خطوط لکھتیں اور اپنے بچے کو اکثر تحفے تحائف بھیجتی رہتیں

لینن کو شطرنج سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ایک دوسرے جلاوطن کے ساتھ گھنٹوں اس میں مشغول رہتے۔ انہیں شطرنج سے اس قدر شغف تھا۔ کہ اکثر خواب میں چلا اُٹھتے "اگر تم نے اپنے وزیر کو بلایا۔ تو میں تمہیں مات دے دوں گا" لینن اکثر کہتے۔ کہ شطرنج کا شوق مجھے والد سے ترکہ میں ملا ہے۔

جلاوطنی کی میعاد کے ختم ہونے کے بعد انہوں نے شطرنج کھیلنا قطعاً ترک کر دیا۔ کہتے
کہ یہ محض تضیع اوقات کا ذریعہ ہے۔

انہیں لاطینی زبان سے گہری دلچسپی تھی۔ کیونکہ وہ رومن طریق پر فصاحت و بلاغت
حاصل کرنے کے مشتاق تھے۔ انکی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ وہ رومن کی طرح فصیح و بلیغ
تھے۔ اور بسا اوقات انکی تقریریں پرانے رومن خطیبوں سے ٹکر کھاتی ہیں۔ سائبیریا
میں انہوں نے ایک خفیہ اخبار "اسکارا" کا اجرا کیا۔ جسمیں دل ہلا دینے والے واقعات
ہوتے۔ وہ رات کو بہت کم سوتے۔ اور ہر وقت تجاویز پر غور کرتے رہتے۔ اس کا لازمی
نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کے قویٰ میں ضعف واقع ہونے لگا۔ اخبار کے سلسلہ میں سائبیریا کی
پولیس نے لینن کے مکان کی تلاشی لی۔ انقلابی لٹریچر اور پوشیدہ خطوط الماری کے نچلے
خانے میں تھے۔ کروپسکیا نے پولیس کے افسر کو ایک بہت اونچی کرسی بیٹھنے کے لئے
دی۔ جب وہ الماری کے اوپر کے خانے تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔ تو لینن نے
انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ ان میں مذہبی لٹریچر ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۰۰ء میں لینن کی جلاوطنی کی میعاد ختم ہوگئی۔ تو انہوں نے یورپین روس کی
طرف مراجعت کی۔ یہاں آکر انہوں نے پھر اپنا کام شروع کیا۔ اور اخبار "اسکارا" از
سر نو جاری کیا۔ اسکارا کے لفظی معنی شعلہ کے ہیں۔ اور اسکارا کے سرورق پر یہ ضرب المثل
لکھی رہتی۔ "یہ شعلہ بھڑک کر ظلم و تعدی کا خاتمہ کر ڈالے گا"

بعض وجوہات کی بناء پر ۱۹۰۲ء میں انہیں ملک چھوڑنا پڑا۔ پیرس میں انہوں نے

لیکچروں کا ایک سلسلہ بعنوان "اکاڈیمی فار سوشل سائینس" شروع کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اگر روس کی دولت اُن کے قبضہ میں ہو تو وہ اُسے کس طرح خرچ کریں۔ انہوں نے پیرس میں ببانگِ دہل کہہ دیا کہ زار روس کی حکومت کا خاتمہ کرنے سے وہ روس میں مفلسی اور نادار ی کا خاتمہ کر دیں گے۔ وہ کہتے "میں ظلم کا خاتمہ ظلم سے کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

۱۹۰۳ء میں انہوں نے دوسری کانگرس سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی میں شرکت کی۔ کانگرس میں پارٹی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ بالشویک کے معنی اکثریت کے ہیں۔ اس لئے اس پارٹی کو جو اکثریت میں تھی۔ بالشویک کے نام سے پکارا گیا۔ اور اقلیت کو منشویک سے منسوب کیا گیا۔ ہر دو لفظوں کے لفظی معنے اکثریت اور اقلیت کے ہیں چونکہ روس میں موجودہ حکومت اکثریت پارٹی کی ہے۔ اس لئے اسے بالشویک کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بتلانا غیر ضروری نہیں ہوگا۔ کہ لینن نے ایک نہایت معمولی اختلاف کی بناء پر پارٹی کو دو حصوں میں منقسم ہو جانے دیا۔ اور عزیز ترین دوستوں سے کنارہ کشی کر لی انہوں نے بڑی بے رحمی سے اپنے رفیقوں کی مخالفت کی۔ اور اپنی تشریح کو جو مارکسٹ اصولوں پر مبنی تھی۔ ترجیح دی یہ وہ وقت تھا۔ جب اُنکی شہرت کو تکبر نخوت اور بیری کا گھن لگ چکا تھا۔ ان کے سب سے زیادہ عزیز دوست ٹراسکی کا خیال جو انہوں نے اپنی کتاب "انقلاب روس" میں ظاہر کیا ہے۔ باوجودیکہ وہ قابل انسان تھا۔ مگر اس نے پارٹی کا نہایت احمقانہ قتل عام کر کے اسکا خاتمہ کر ڈالا۔

مئی ۱۹۰۵ء میں کانگرس آف سوشل ڈیموکریٹک کا تیسرا اجلاس لندن میں منعقد ہوا۔

صرف لینن کے رفیقوں اور دوستوں نے اس میں شرکت کی لینن نے خطبۂ صدارت میں کہا۔ زارِ روس کا خاتمہ ضروری ہے۔ اور روس کو قعرِ ذلت سے نکالنے کے لئے ایک مضبوط ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے۔ اسوقت وہ بالشویک پارٹی کے مسلمہ لیڈر تسلیم کئے جاتے تھے۔

تیسری کانگرس کے بعد وہ پھر پیٹرز برگ آئے۔ پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا انکی جیب سے دو ہزار روبل کے نوٹ اور کچھ دستاویزیں برآمد ہوئیں۔ پولیس نے دو ہزار رُوبل ہضم کرنے کے لئے دستاویزوں کو آگ لگا دی۔ اور لینن کو بری کر کے رپورٹ کر دی کہ ان کے پاس سے کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔ اِن کی بیوی کا بیان ہے کہ اگر وہ دستاویزیں پڑھی جاتیں۔ تو یقیناً لینن کے لئے سوائے موت کے کوئی اور سزا تجویز نہ ہوتی۔ روس میں ایک ہفتہ کے قیام کے بعد وہ پھر دوسرے ممالک کی جانب چلے گئے وہ اپنی بیوی کو اکثر اپنے حالات لکھتے۔ رہتے۔ مگر تفصیل کے بارے میں محتاط ہو گئے۔

لینن کی والدہ کو اُن سے خاص محبت تھی۔ وہ بیچاری جب اُن کے دیکھنے کو ترس گئیں۔ تو انہوں نے ضعیف العمری میں پریگ کا سفر اختیار کیا۔ جہاں وہ مقیم تھے پریگ میں انہوں نے اپنا نام مُڈامک رکھ لیا تھا۔ جب بیچاری بڑھیا پریگ میں پہنچی تو معلوم ہُوا کہ اس کا بیٹا میونخ پہنچ گیا ہے۔ محبت کشاں کشاں اُسے وہاں لے گئی۔ لینن کی بیوی ان کے ہمراہ تھی۔ بڑی مشکل سے لینن کو تلاش کیا۔ اور تینوں اکٹھے زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔

ان ایام میں لینن اپنی کتاب "کیا کرنا چاہیئے" لکھنے میں مصروف تھے شام کے وقت وہ بیوی اور ساس کو ہمراہ لیکر سیر کے لئے نکل جاتے۔ اور راستہ میں چپکے چپکے کتاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔

اخبار "اسکرا" کا انہوں نے پھر اجرا کر دیا۔ وہ خفیہ طور پر اسے لکھواتے چھپواتے اور اس کو ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم کرتے۔ چونکہ انہیں اکیلے ہی یہ سب کام انجام دینا پڑتا اس لئے وہ تھک کر چکنا چور ہو جاتے۔ مگر مایوسی کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیتے بالآخر پریس کے مالک نے اخبار کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ آخر یہ طے پایا کہ عزم لنڈن کیا جائے۔ راستے میں بھٹکتے پھرتے کے بعد وہ لنڈن پہنچ گئے۔ اسٹیشن پر ان کے رفیق ایلک سیو نے ان کا استقبال کیا۔ اس دن لندن میں دھند کا زور تھا۔ اور تمام شہر اندھیرا محیط تھا۔ غریب الوطنی سرمایہ کی کمی مصائب کا ہجوم اور اس پر دھند ان کے دل حزیں کو بیقرار کرنے کے لئے کافی سے زیادہ جانکاہی کے سامان تھے۔

اگرچہ سائبیریا کی جلاوطنی کے زمانہ میں انہوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ روسی زبان میں کیا تھا۔ مگر لنڈن پہنچکر انہوں نے محسوس کیا کہ انکی زباندانی انکے خیالات کی ترجمانی کے لئے ناکافی تھی۔ وہ لیکچروں میں جاتے اور ہائیڈ پارک میں اپنا زیادہ وقت تقریروں کے سننے میں صرف کرتے۔ انکا تعارف دو ایسے انگریزوں سے ہوگیا جنہیں روسی زبان سیکھنے کا شوق تھا۔ اور اس کے عوض لینن نے ان سے باقاعدہ طور پر انگریزی زبان سیکھنی شروع کر دی۔

لینن

لنڈن کی سیاحت میں وہ تمام دن بس کی سواری میں گزار دیتے۔ وہ بس کے اوپر بیٹھ کر لنڈن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے۔ زیادہ وقت ان کا مزدور پیشہ لوگوں میں گذرتا۔ وہ کتب خانوں میں پہنچنے سے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں لوگوں سے تبادلہ خیالات کرتے۔ گرجوں میں جا کر لوگوں کے مذہبی احساسات کا اندازہ لگاتے۔ ایک دن سوشل ڈیموکریٹک گرجے میں گئے۔ جہاں ایک مزدور نے انجیل کا درس دینے کے دوران میں کہا۔ کہ جس طرح یہودی مصر سے بھاگے تھے۔ اسی طرح ہم سرمایہ داروں سے بھاگ کر سوشلزم کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ سروس کے بعد تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر دعا کی کہ اے خداوندا ہمیں سرمایہ دار سے نجات دلا کر اپنی عافیت میں لے لے۔

وہ ہر روز مارکس کی قبر پر جاتے اور گھنٹوں اس سوشلزم کے پیغمبر کے مقبرہ پر سکوت کے عالم میں عقیدتمندی کے پھول نچھاور کرتے۔

لنڈن میں انہوں نے ایسٹر کے فرضی نام سے وقت گذارا۔ اُن کی صاحب خانہ انہیں جرمن خیال کرتی۔ چونکہ انگریزی خوراک اُن کی طبیعت کے موافق نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ چند سستے کمرے کرایہ پر لیکر خود اپنی خوراک کا انتظام کریں۔

اس اثناء میں پلیک نیو، پامان، کراچین اور ٹراسکی روس کے مختلف قید خانوں سے بھاگ کر لنڈن پہنچ گئے تھے۔ اور سب نے لینن کے گرد و نواح کے مکانوں میں سکونت اختیار کر لی تھی یہ سب لوگ شام کو لینن کے ہاں اکٹھا ہوتے۔ اور روس میں ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے کی تجاویز پر غور کرتے۔

کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے ٹراسکی کو پیرس بھیج دیا۔ اور خود جینوا جانے کا ارادہ کر لیا مگر تشویش اور غم کی وجہ سے انہیں ایک خاص قسم کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں سفر ملتوی کرنا پڑا۔ روپیہ ان کے پاس نہ تھا۔ جس سے وہ کسی معالج کو بلا کر دوا کراتے۔ آخر ٹوٹکوں سے کچھ افاقہ ہوا۔ اور ۱۹۰۳ء میں جینوا جانے کے لئے انہوں نے لندن کو خیرباد کہا۔ سفر میں انہیں شدت کا بخار ہو گیا۔ جینوا پہنچ کر غربا کے محلے میں ایک کم حیثیت مکان کرایہ پر لیکر اقامت اختیار کی۔ وہ اپنی کتابوں کے صندوقوں کو بطور کرسی اور میز کے استعمال کرتے مگر دھن کے دھنی افاقہ ہونے پر پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

جینوا میں انہوں نے اپنے مکان پر ایک مجلس منعقد کی جس میں تمام جلاوطنوں نے شمولیت کی۔ ٹراسکی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ شام کو سب کے سب قہوہ خانہ لینڈ روڈ میں جمع ہوتے۔ اسکارہ کے لئے مضامین سوچتے۔ بحثیں ہوتیں۔ تنقیدیں لکھتے اور مادرِ وطن کو ظلم سے نجات دلانے کے لئے اپنی جانوں کو جوکھوں اور خطروں میں ڈالتے۔ ۱۹۰۵ء میں روسیوں کی ایک جماعت جینوا پہنچی۔ اور کہا کہ ہم اسکارا کو روس میں چھاپنے اور تقسیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر انہیں یہ تجویز پسند نہ آئی۔ ۱۹۰۵ء میں لینن نے فن لینڈ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر بعض وجوہات کی بنا پر انہیں ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اور وہ یک لخت روس جا پہنچے۔

یہ وہ وقت تھا۔ جب روس میں جاپان کی فتح کی وجہ سے ایک ہیجان برپا تھا۔ شکست کی وجہ سے پہلا انقلاب شروع ہو چکا تھا۔ ملک میں لینن کا داخلہ قانوناً بند تھا۔ اس لئے

انکی پارٹی نے خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں قطعی طور پر منع کر دیا۔ کہ وہ کسی تحریک میں حصہ نہ لیں۔

۱۹۰۵ء کے ماسکو کے انقلاب کو لینن بہت اہمیت دیتے تھے۔ جب ماسکو کی گلیوں میں انقلاب پسند حکومت کے سپاہیوں سے لڑتے تو لینن وہاں پہنچتے۔ واقعات کی تفصیل دریافت کرتے۔ اور صحیح واقعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ کہتے "یہ پہلی لڑائی ہے۔ جس میں روس کے مزدوروں نے حکومت کیخلاف حصہ لیا ہے۔ اور تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

جب مزدور اور کسان کے مقابلہ میں حکومت کی ایک نہ چلی تو بالشویک پارٹی کو خلاف قانون اور ناجائز قرار دیا گیا۔ مگر خفیہ طور پر پارٹی نے اپنی جدوجہد جاری رکھی ۱۹۱۶ء میں پولیس کو پتہ چلا۔ کہ لینن روس میں موجود ہیں۔ اس لئے ان کی حراست کا وارنٹ جاری ہوا۔ مگر وہ وارنٹ کی تعمیل سے قبل فن لینڈ پہنچ گئے۔ جہاں ہزاروں مزدور اُن کے استقبال کے لئے آئے اور سر اور آنکھوں پر بٹھلا کر لے گئے۔

۱۹۰۷ء میں لینن فن لینڈ سے پیرس پہنچے۔ جہاں مشہور و معروف افسانہ نویس گورکی سے اُن کے مراسم بہت زیادہ ہو گئے۔ پیرس کے ایک اخبار نے ازراہ استحقار لکھا۔ کہ ہم روس کی آدھی سلطنت اُس شخص کو دینے کے لئے تیار ہیں۔ جو لینن زناف اور کمینو کے علاوہ کسی چھوٹے بالشویک کا نام بتلائے۔ ۱۹۱۲ء تک وہ مختلف ممالک میں سرگرداں رہے۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے گیلیشیا میں ایک خفیہ روسی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ روسی انقلاب پسند جوق در جوق

اِن کے پاس مشورہ کے لئے آپہنچے۔ وہ اسی دُھن میں لگے ہوئے تھے۔ کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی۔

جنگِ عظیم کے دوران میں وہ آسٹریا جا پہنچے۔ جہاں انہیں روسی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا گیا۔ اُن کے دوستوں کی تشویش بہت بڑھ گئی۔ انہوں نے وائنا میں وکٹر آلڈر کو تار دیا۔ جن کی وساطت سے وہ رہا کئے گئے۔ وہاں سے وہ سوئٹزرلینڈ پہنچے۔ اِن تمام ایام میں اُنکی وفادار بیوی اُن کے ساتھ رہیں۔ وہ باقاعدہ طور پر اُن کے مصائب میں حصہ لیتیں۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک وہ سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہے۔ اور اُن تمام مجلسوں اور کانفرنسوں میں شمولیت کرتے جو روس کی آزادی کے لئے منعقد ہوتیں۔ لینن برملا کہتے کہ ہر ممکن طریقے سے جنگِ عظیم کا خاتمہ کر ڈالنا چاہیئے۔ وہ علی الاعلان کہتے کہ روس کی خوش قسمتی اس امر میں ہے کہ جنگِ عظیم میں اُسے شکست ہو جائے۔ اور زار کی سلطنت کا خاتمہ ہو جائے۔ وہ دِن دُور نہیں کہ روس میں انقلابِ عظیم پیدا ہوگا۔ اور ظلم و ذلت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائیگا۔

لینن کی پیشنگوئی انقلاب کے بارے میں پوری ہو کر رہی۔ فروری ۱۹۱۷ء میں انقلاب برپا ہوا۔ انقلابیوں نے عدالتوں کو آگ لگادی۔ بری اور بحری فوجوں میں غدر برپا ہو گیا۔ باقاعدہ طور پر جنگ شروع ہو گئی۔ اور چند روز بعد زارِ روس کو معزول کر کے جمہوری سلطنت قائم کی گئی۔ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کہ زارِ روس اور اُس کے خاندان سے کیا سلوک ہوا۔ لینن نے فوراً روس پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر حلیفوں نے انہیں پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ سویڈن سے انہوں نے ایک جعلی پاس پورٹ بنوا لیا۔ مگر جب انہیں

معلوم ہوا۔ کہ جہاز والے بنظرِ غائر پاس پورٹوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ تو انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ وہاں سے وہ جرمنی پہنچے اور جرمنی سے روس۔ انہیں خطرہ تھا۔ کہ روس پہنچتے ہی ان کی گرفتاری عمل میں لائی جائے گی۔ مگر انکی توقع کیخلاف ہزار ہا اشخاص اسٹیشن پر ان کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے۔ باقاعدہ طور پر ان کا جلوس نکالا گیا۔ اور وہ راستہ میں جابجا تقریریں کرتے اپنے مکان پر جا پہنچے

روس میں عارضی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ مگر وہ بالشویک پارٹی کے اصولوں پر مبنی نہ تھی۔ ۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو لینن نے اخبار پروا میں اپنی پارٹی کا پروگرام شائع کیا۔ جس میں وضاحت کے ساتھ بتایا کہ جلد سے جلد وہ علاقے آزاد کر دئے جائیں گے جو حکومت نے ملحق کر رکھے ہیں۔ حکومت لوگوں کے ہاتھ میں دی جائیگی۔ اور اصلی معنوں میں جمہوریت ہو گی۔ پولیس اور فوج کے محکمے اڑا دئے جائیں گے۔ تمام زمین دستکاری حرفت اور صنعت سلطنت کی ملکیت تصور ہو گی۔ بنکوں کا خاتمہ کر ڈالا جائے گا۔ کوئی متنفس روس میں بھوکا نہیں رہیگا۔ یہ ضروری ہو گا۔ کہ تمام لوگ پیٹ بھر کر کھانا کھائیں۔ بجائے اسکے کہ چند لوگ پلاؤ یا قورما کھا کر مست رہیں اور دوسرے پیٹ پر پتھر باندھ کر فاقہ کریں۔

عارضی حکومت کے ارباب بست وکشاد کو لینن کی تجاویز پسند نہ آئیں۔ اسلئے انہوں نے لینن کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ وہ بھاگ نکلے۔ ان کی گرفتاری کے لئے دو لاکھ کا انعام مقرر ہوا۔ لینن نے ایک دوست کے ہاں پیٹرز برگ کے نواح میں ایک گاؤں میں پناہ لی۔ جب وہ چھپتے چھپتے اکتا گئے۔ تو ایک دن قریب کے سرکاری

جنگل میں اپنی بندوق لیکر نکل گئے جنگل کے افسر نے دیکھ پایا۔ ان سے بندوق چھین لی اور نہایت چپ چپیں ہوا خیر گذری۔ کہ لینن کا میزبان وقت پہ آپہنچا۔ اور اس کو یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ میرا مہمان فن لینڈ کا رہنے والا ہے۔ اور روسی قطعاً نہیں جانتا۔

موسم سرما کے آغاز میں لینن اور زنمات نے پیٹرز برگ کو الوداع کہا۔ اور فن لینڈ جا پہنچے لینن وہاں جعلی پاس پورٹ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اور بھیس بدلکر جرمنی جا پہنچے۔ جرمنی سے وہ ہر روز ایک مقالہ افتتاحیہ اسکار کے لئے لکھ کر ایک ریلوے آفیسر کی وساطت سے پیٹرز برگ بھیجدیتے۔

جرمنی میں قیام کے زمانہ میں لینن کی ایک پولیس افسر سے بہت دوستی ہوگئی۔ جو ہر طرح سے ان کی امداد کرتا جوں جوں روس میں واقعات وحشتناک صورت اختیار کرتے لینن گھبراتے بالآخر انہوں نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ روس کے سرحدی علاقہ میں مقیم ہوجائیں تاکہ موقعہ پر فوراً روس پہنچ جائیں۔ پولیس افسر کے ذریعہ سے وہ جعلی پاسپورٹ بنانے میں کامیاب ہوگئے اور حجام سے مصنوعی بال اور لمبی داڑھی حاصل کر لی۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء کے آغاز میں وہ پیٹرز برگ پہنچ گئے۔ ۲۴ر اکتوبر کو دوسرا انقلاب زور شور سے شروع ہوگیا۔ ۲۵ر اکتوبر کو انقلابیوں نے عارضی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور ۷ر نومبر کو ملک کے تمام ڈاکخانے اُن کے ہاتھ لگ گئے۔ فوجوں نے عارضی حکومت کیخلاف اعلان کر دیا۔ اور بالشویک پارٹی سے جا ملے۔ وزیر اعظم جس نے حکومت قائم کر رکھی تھی۔ بھاگ نکلا اور بالشویک پارٹی برسر اقتدار آگئی۔ لینن نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اور

زبردست تقریر کی۔ اگلی صبح کو انقلابیوں نے ملک پر پورا قبضہ کر لیا۔ اور لینن جمہوریت کے صدر اوّلین منتخب کئے گئے۔

صدر ہوتے ہی انہوں نے فوجوں کو ترتیب دی۔ ملک میں امن قائم کیا۔ جن علاقوں میں سخت قحط برپا تھا۔ وہاں خوراک بہم پہنچانے کے انتظام کئے۔ اور پھر جرمنی سے عارضی صلح کر لی پیٹرز برگ کی جگہ ماسکو کو دارالسلطنت بنایا۔ لوگوں نے اس تبدیلی کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ مگر لینن نے برہم ہو کر کہا۔ اگر پھر لڑائی چھڑ جائے۔ تو جرمن فوراً پیٹرز برگ پر قبضہ کر لے گا۔ مگر ماسکو پہنچنا کارے دارد کا معاملہ ہے۔ ماسکو میں وہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے۔ ایک معمولی مکان میں سکونت تھی۔ اور سوائے ملکی بہبود کے ان کے پیش نظر کچھ نہ تھا۔

۱۹۱۸ء میں دورالیکن نے لینن پر حملہ کیا وہ سخت زخمی ہوئے۔ اور عرصہ دراز تک ہسپتال میں صاحب فراش رہے۔ انکی بیماری کے زمانہ میں پھر ابتری پھیل گئی اور ملک بھر میں مہیب خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ بالشویک پارٹی نے نہایت بُردباری سے کام لیکر ان خانہ جنگیوں کا خاتمہ کیا۔ اور ملک پر پھر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ لینن اس زمانہ میں بھی جب کہ وہ سخت علیل تھے۔ روزانہ رپورٹیں سنتے اور مناسب احکام جاری کرتے ملک کی حالت دگرگوں تھی۔ خوراک کی کمی سے قحط برپا تھا۔ دوسری طاقتوں نے تمام راستے مسدود کر رکھے تھے۔ اور باہر سے غلہ کی آمد و رفت بند تھی۔ لینن ایک مدبرانہ چال چلے اغراض و مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر سوویٹ اصولوں کو یک قلم منسوخ کر دیا۔ اور حکم

دے دیا۔ کہ ہر متنفس کی جائیداد علیحدہ علیحدہ ہوگی۔ کرنسی کا اجرا کیا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ کے اندر ہی دکانیں کھل گئیں۔ امریکہ اور مغربی یورپ سے غلہ آنا شروع ہو گیا۔ اقتصادی حالت بہتر ہو گئی۔ لوگ کاروبار میں دلچسپی لینے لگے اور لینن کے تدبر کا یہ ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ اگرچہ یہ بات کمیونسٹ اصولوں کے خلاف تھی۔ مگر وہ سمجھتے تھے۔ کہ انکے سامنے لوگوں کا مفاد ہے نہ کہ اصول کی اندھا دھند پیروی انکی پارٹی کے لوگ ان سے بگڑے مگر انہیں اس کی بھی چنداں پروا نہ ہوئی۔

لینن کو اپنے اوپر بہت اعتماد تھا۔ ان کی تمام تر زندگی اس امر کی شاہد ہے۔ کہ راستی کے معاملے میں وہ اپنے عزیز ترین دوستوں کی بھی پروا نہ کرتے۔ بلکہ بسا اوقات بیوی کو بھی نظر انداز کر جاتے وہ اصول کے لئے پارٹی اور دیگر رفقا کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ وہ کبھی خطرات سے مرعوب نہ ہوتے۔ بلکہ قومی مفاد کے لئے ہر خطرہ میں کودنے کے لئے تیار رہتے۔ غربت افلاس اور چھیچھڑوں میں بحیثیت ڈکٹیٹر ہونے کے انکی بعینہٖ وہی حالت تھی جو ہر مزدور کی تھی۔ لفظ کامریڈ ان کی ایجاد کردہ اصطلاح ہے۔

شروع شروع میں لوگ اسکی بڑی ہنسی اڑاتے لیکن آزادی کے حصول کے لئے وہ خون گرانے کی مطلقاً پروا نہ کرتے۔ جب وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوتے۔ تو انکی طبیعت پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ کئی کئی دن تک وہ فاقہ کشی کرتے۔ مگر اصول سے ذرا بھی نہ ہٹتے مزدور کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے اس کے علاج کی سعی کرتے بحیثیت ڈکٹیٹر وہ مزدوروں سپاہیوں کسانوں اور غریبوں کے پاس گھنٹوں کھڑے ان کی تکلیف کا ماجرا

سنتے رہتے۔ اور ان کے رفع کرنے کی امکانی تدابیر عمل میں لاتے۔ وہ محض کمشنوں کی رپورٹ پر اکتفا نہ کرتے۔ بلکہ خود گاؤں گاؤں پہنچکر حالات کا اندازہ لگاتے۔ اور اس کے دفعیہ کی صورتیں نکالتے۔ وہ غریبوں سے قطعی نفرت نہ کرتے۔ بلکہ اُن سے مونس ہمدرد دوست اور مددگار کی حیثیت سے پیش آتے۔

انہیں امیرانہ ٹھاٹھ سے سخت نفرت تھی۔ اِن وجوہات کی بناء پر جہاں اُن کا پسینہ گرتا وہاں لوگ اپنا خون بہاتے۔ ۱۹۱۹ء کے قحط کے زمانہ میں اُن کے گھر میں ایک وقت سے زیادہ کا کھانا نہ ہوتا۔ لوگ خود بھوکے رہ کر اِن کے لئے کھانا لاتے۔ وہ کہتے میں اسے بدترین فعل سمجھتا ہوں۔ کہ لوگ بھوکے رہیں اور میں خود عیش کی زندگی گذاروں

اٹلی کے ماہی گیر لینن کے حسن اخلاق کے گرویدہ تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے گورکی سے لینن کے متعلق دریافت کیا کہ ان کا کیا حال ہے۔ جب گورکی نے بتلایا کہ لینن ملک کے ڈکٹیٹر مقرر ہو چکے ہیں۔ تو ماہی گیروں نے کہا بخدا وہ لوگوں کی بہتری کے لئے ڈکٹیٹر بنا ہے۔ وہ نہایت ہی ایماندار اور روشن ضمیر انسان ہے۔

۱۹۰۷ء میں لنڈن کے مزدوروں نے اِنکی بابت کہا۔ کہ وہ اصلی معنوں میں ہمارا کامریڈ ہے۔

لینن بڑے مردم شناس تھے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو فوجی جرنیل مقرر کیا۔ جو فوج کے ابتدائی مراحل سے بھی ناآشنا تھے۔ ان لوگوں کو کمانڈر مقرر کیا۔ جنہوں نے کبھی تلوار کو چھوا تک نہیں تھا۔ ایڈیٹروں کو سفیر مقرر کر کے دور دراز ملکوں میں بھیجا اور کسانوں کو ملکی

حکومت کے اندر ایسے عہدے دئے۔ کہ انسان سن سن کر حیران رہ گیا۔ لیکن ان سب عہدہ داروں نے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے انجام دئے۔ کہ ان سب کا تقرر لینن کا ایک معجزہ تصور ہوتا ہے۔ روسی سلطنت کا آئین دنیا میں آپ ہی اپنی مثال ہے غم، پریشانیاں، تشویش، فاقے، افلاس، غربت، دن رات کی مسافت اور روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا۔ آخر اپنا رنگ دکھا گیا۔ مارچ میں اُن کی دائیں طرف فالج گرا۔ اس حالت میں بھی وہ سلطنت کے کاموں میں باقاعدہ حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے ہر ممکن دوا کی مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

مرض کی حالت میں بھی انہوں نے تین معرکتہ الآرا تقریریں کی۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے لکھنا سیکھ لیا تھا جس سے جملہ کاروبار سلطنت کرتے کچھ وقفے کے بعد انکی حالت رو بصحت ہوگئی۔ مگر یہ عارضی تغیر تھا۔ کرسمس کے موقع پر انہوں نے بیکس غریب بچوں کے لئے کرسمس ٹری بنوائے۔ اور بچوں کو اپنے مکان پر بلا کر خود ان کی خوشیوں میں شامل ہوئے۔ آخر بیماری پھر عود کر آئی۔ انہیں پہلے ہی معلوم ہو گیا۔ کہ وقت قریب آرہا ہے۔ وہ اس سے قطعی ہراساں نہ ہوئے۔ رشتہ داروں کو تسلی دیتے۔ دوستوں کو اتفاق کی نصیحت کرتے۔ اور کہتے۔ میری موت میں بھی ایک راز مضمر ہے۔

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

بالآخر ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو شام کے چھ بجے لینن اس دار فانی سے کوچ کر گئے ڈاکٹروں نے ان کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا۔ اور انہیں تعجب ہوا کہ یہ شخص اس انتہائی

علالت میں کس طرح اتنی دیر زندہ رہا۔ سب نے بالاتفاق کہا۔ کہ وہ اپنے آپ کو ملک و ملت کیخاطر قربان کر گیا۔

ان کے انتقال کے بعد ان کی قدر و منزلت کے اصلی جوہر یورپ پر ظاہر ہوئے ان کی زندگی میں بیرونی پریس انہیں ڈاکو اور جرمن جاسوس خیال کرتا۔ لیکن سچائی ظاہر ہوتی شروع ہوئی اور بڑے بڑے مؤرخوں اور مصنفوں نے ان پر کتابیں لکھیں کارل کاٹسکی اور آٹو بور نے لکھا۔ کہ وہ ایک عظیم الشان ہستی تھی۔ جو دنیا سے اٹھ گئی۔ پان آبو نے کہا کہ وہ اعلےٰ پایہ کا مدبر تھا۔ بیرٹ نے کہا۔ کہ وہ خاص قابلیت کا انسان تھا۔ اسکاٹ قومی دور سے لبریز تھا۔ ٹامس مین نے اعتراف کیا۔ کہ وہ مجسم تنظیم تھا۔ اس کی قوتِ ارادہ بلا کی تھی۔ رومن نے عقیدت کے پھول چڑھائے۔ مشہور و معروف انگریز انشاء پرداز رسل نے لکھا۔ کہ لینن کی موت نے دنیا کو ایک جلیل القدر انسان کے جذبات سے محروم کر دیا۔ وہ ایک نکتہ رس فلسفی اور ٹھوس کام کرنے والا انسان تھا۔ برنارڈ شا نے خون کے آنسو بہائے۔ اور کہا کہ وہ دن دُور نہیں جب کہ لنڈن میں لینن کا بت جارج واشنگٹن کے پہلو میں نصب کیا جائے گا۔ آج انگریزی پریس لینن کیخلاف ہے۔ کل وہ جارج واشنگٹن کے خلاف زہر اُگلتا تھا۔

مزدوروں اور کسانوں کی محبت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے لینن کی موت کی خبر کو باور کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔ اور کہنے لگے۔ کہ لینن نے موت کا بہانہ کیا ہے۔ تاکہ یہ دیکھیں کہ ملک کے وزراء کس طرح کام کرتے ہیں کچھ عرصہ

کے بعد وہ پھر جہنم میں آجائیں گے۔ اور اچھا کام نہ کرنیوالوں کو اُن کی بدکرداری کی سزا دینگے

یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں کہ لینن ہی واحد شخص تھا جس نے زارِ روس کی مستبد سلطنت کا خاتمہ کیا۔ وہ پیٹر اعظم سے کسی حیثیت میں کم نہ تھے۔ لینن پیٹر اعظم کے مداح تھے۔ انہوں نے پیٹروگریڈ کے شہر میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دی۔ وہ کہتے کہ پیٹر پہلا انقلابی شخص تھا اور اُن کی تعمیرات میں مداخلت کرنا گناہ ہے۔

لینن کی کامیابی کا راز اسی امر میں تھا کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم پر ملک بھر کی تنظیم کو محمول کرتے تھے۔

لینن نے تمام ملک میں کاشت کو سائنٹفک طریق پر رائج کیا گاؤں گاؤں میں بجلی لگا دی۔ انگریز، امریکن اور جرمن انجنیروں کو ان کے ملکوں سے بلا بلا کر چند دنوں میں اُن کی امداد سے ملک کی کایا پلٹ دی ماسکو میں ایک درسگاہ قائم کی جس سے وہ لوگوں کی ذہنیت اور استعداد کا اندازہ لگاتے۔ اور ہر شخص کے سپرد وہی کام کیا جاتا جو اس کا اہل نظر آتا۔

دراصل یہ قابلِ غور بات ہے۔ کہ آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں لینن نے ملک کی کس طرح کایا پلٹ دی جہاں سینکڑوں آدمیوں میں سوائے چند ایک کے کوئی لکھا پڑھا نظر نہ آتا تھا۔ وہاں ۱۹۳۰ء میں کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو ان پڑھ ہو۔ سفری اسکول اور لازمی تعلیم نے وہ اعجاز کر دکھایا۔ کہ اس سے پیشتر نظر نہیں آیا تھا۔ شفاف سڑکوں نہروں صنعت و حرفت کے کارخانوں کا جال اس طور پر ملک میں پھیلا دیا گویا وہ زمین کے خود رَو پودے ہیں۔

الغرض اِس انیس سالہ بچے نے جو پیشین گوئی کی تھی۔ کہ زار کی سلطنت کو وہ تباہ کرے گا۔ حرف بحرف سچی نکلی۔ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ گمنامی میں دربدر پھرنے والا انسان ایک عظیم الشان سلطنت کی طرح ڈالیگا۔ کیسے معلوم تھا۔ کہ ایک فاقہ مست انسان بنی نوع انسان کو ظلم و تعدی کی زنجیروں سے نجات دلا کر امن و عافیت کی ایک لہر دوڑا دے گا۔ جب اُس نے پہلی اور دوسری کانفرنسیں قائم کیں۔ اور کہا کہ تیسری کانفرنس کے بعد روس میں تھرڈ انٹرنیشنل کی حکومت ہوگی۔ تو عوام اس پر آوازے کستے اور اس کے دماغی توازن کی صحت میں شک و شبہ کرتے۔ مگر قدرت دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔ کہ اسکی بے لوث قربانیاں کبھی رائگاں نہیں جاسکتیں۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ لینن کی وفات کے بعد ملک میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں ہمیں اس سے بھی واسطہ نہیں کہ حکومت اِن لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جن کی نیت پر دنیا شک کرتی ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وہ پھر گمراہی کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔ مگر ہم یہ ضرور کہیں گے۔ کہ صدیوں بعد جب روسی ماں اپنے ننھے بچے کو زار روس کے ظلموں کا افسانہ سنائیگی۔ تو اسکی آنکھوں سے محبت کے آنسو جاری ہوں گے وہ جھوم کر کہیگی۔ کہ عرصہ ہوا ایک شخص لینن نے ہمیں ظلم و تعدی سے نجات دلائی تھی۔

ایچ۔ جی۔ ویلز

تمام مہذب قوموں کے عروج کی تاریخ مصنفوں اور شعراء پر منحصر ہوتی ہے۔ یونان کی تہذیب و ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کرنیوالوں کے لیئے ہومر کی ایلیڈ کبھی نظرانداز نہیں ہو سکتی۔

یہ امر بھی مسلمہ طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ فردوسی کا مشہور و معروف شاہنامہ ایرانیوں کو ابھارنے کا باعث ہوا۔ اسی طرح انگلستان میں ویلز کا نام ابدالآباد تک زندہ رہیگا۔ اور انکی شہرہ آفاق تصانیف ادبیات کی دنیا میں زندہ جاوید رہیں گی۔

ہربرٹ جارج ویلز ۲۱ ستمبر ۱۸۶۶ء میں کو بروملے میں جو کنٹ میں واقع ہے پیدا ہوئے آپ کے والد جوزف ویلز کرکٹ کے مشہور و معروف کھلاڑی تھے۔ ابتدائی تعلیم مِڈہرسٹ کے گرامر اسکول میں پائی۔ وہاں سے فارغ ہو کر ایک بزاز کے ہاں ملازم ہو گئے۔ مگر انٹرنس میں وظیفہ حاصل کرنے کے بعد رائل کالج آف سائنس میں داخل ہوئے۔ جہاں آپ نے طبعیات، علم الکیمیا، علم النجوم، علم الہیئت، علم الاسعنہ۔ اور ریاضیات میں باقاعدہ درس لیا۔ ۱۸۸۸ء میں دارالعلوم لندن سے فرسٹ کلاس آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری لینے کے بعد ایک

پرائیویٹ مدرسہ میں بطور معلم ملازم ہو گئے۔ علاوہ ازیں نجی طور پر بھی درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۳ء میں آپ نے پال مال گزٹ کے لئے باقاعدہ مضامین لکھنے شروع کئے اور ۱۹۰۵ء میں انکے اعلیٰ مضامین کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کو "سیچر اینڈ سٹرڈے ریویو" کا نامہ نگار مقرر کیا گیا۔

۱۹۰۱ء میں آپ نے اپنی پہلی کتاب "دی ٹائم مشین" سپرد قلم کی۔ ان کی تصانیف کی یہ خاص خوبی ہے۔ کہ وہ سائنس کے مشکل سے مشکل مسائل کو افسانوں میں بھر دیتے ہیں عام طور پر ان کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ سوشلزم کے اصول کو عوام پر ایک نمایاں انداز میں ظاہر کر دیں۔ ۱۹۰۵ء میں انکی کتاب "خیالات" . . . .
. . شائع ہوئی۔ جس سے ان کی قابلیت کی دھاک بندھ گئی۔ اور سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ محض افسانہ نویس ہی نہیں بلکہ قدرت نے انہیں سوشلزم پر لکھنے کے لئے خداداد ملکہ عطا کیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں انہوں نے انجن سے شروع کر کے مختلف مضامین پر مقالے تحریر کئے ہیں۔ انہوں نے نہایت مدلل طریقہ سے "جنگ" "زمانوں کا متضاد ہے" "اخلاق" اور "مذہب پر یقین" کے عنوان سے اس خوبی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں ان کی کتاب "آئندہ کی ایجاد" شائع ہوئی۔ اس کے پڑھنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں سائنس میں کس قدر دخل ہے۔ قریب قریب ان تمام ایجادوں پر جو آج عمل میں آ رہی ہیں۔ انہوں نے نہایت خوبی کے ساتھ بحث و تحقیق کی ہے۔ پھر "نوع انسانی کی تعمیر" شائع ہوئی جسمیں بتلایا گیا ہے

کہ انسان کہاں کہاں پہنچ رہا ہے۔ وہ کیسے اور کیونکر شروع ہوا۔ اور کس طرح درجہ بدرجہ تمام منازل طے کرتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ پھر ماڈرن یوٹیپار (MODERN UTOPIA. نکلی۔ اسمیں نہایت خوبی سے ہوائی قلعوں کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے۔ کہ آج مشاہدہ سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ عوام الناس کس طور پر اس مرض میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ "نیو ورلڈ فار اولڈ" کے شائع ہونے پر انکی شہرت کا آفتاب نصف النہار کو پہنچ گیا۔ اس کتاب میں انہوں نے خیال آرائی کی ہے۔ کہ لوگ پرانے زمانے سے نکل کر کس طور پر نئے زمانے میں داخل ہو رہے ہیں۔

ان کتابوں کی تصنیف کے بعد انکی طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئی۔ اس فن کے بھی آپ مرد میدان ثابت ہوئے۔ "ویلز آف چانس" اور محبت اور مسٹر لیویشام" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کو کیرکٹر کے بیان کرنے میں کتنا کمال حاصل ہے۔ "جنگ عالم" (WAR OF THE WORLD) "کیپس" اور "ٹانو بنگے" کے مطالعہ سے لوگ ششدر رہ گئے اور ان کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ قدرت نے آپ کو آرٹ کے بیان میں وہ ملکہ عطا کیا ہے۔ کہ جو اس سے قبل کے افسانہ نویسوں میں مفقود تھا۔ ان کی افسانوں کی مشہور و معروف کتابیں "سیاحت عجیب" (THE WONDERFUL VISIT) "ڈاکٹر ماریو کا جزیرہ"۔ (THE ISLAND OF DR MOREAU) "بیداری کے بعد" (WHEN THESLEEPER WAKES) "باغبان کے افسانے" (THE PLANTER STORIES.) "چاند میں پہلا انسان" (THE FIRST MAN IN THE MOON.) "دیوتاؤں کی غذا" (THE FOOD OF THE GODS.)

ایچ۔جی۔ویلز

ان دی ڈیز آف دی کامٹ" (IN THE DAY OF THE COMET) "ہوائی جنگ"
(THE WAR IN AIR) "مسٹر پولی کے سوانح" ہیں۔ ہر ایک کتاب میں ٹھوس سے ٹھوس مسائل اور مضامین کو اس خوبی سے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔ کہ پڑھنے والا خراج تحسین ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"ہوائی جنگ" میں ہوائی جہازوں کے فن حرب پر تنقید کی ہے۔ آئن ویرونیکا (ANNEVERONICA) میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ لڑکیاں کس طرح آزاد ہو کر والدین کے قبضہ اور اقتدار سے نکل رہی ہیں
"دی نیو میچاولی" (THE NEW MACHIA VELLI) "شادی" (MARRIAGE)
مسٹر بریٹلنگ سیز اٹ تھرو (MR BRATILING SEES IT THROUGH) "خدا ان دیکھے بادشاہ کی حیثیت میں" (GOD THE INVISIBLE KING) "دل کے پوشیدہ مقامات" (THE SECRET PLACE OF THE HEART) "جان اور پیٹر" (JOAN AND PETER) دیوتا صفت انسان" (MENLIKE GODS) "ولیم کلیسولڈ کی دنیا" (THE WORLD OF WILLAM CLISSOLD) اور "مسٹر بیٹس ورتھی آن رمپول آئی لینڈ" (MR BETTS WORTHY ON RAMPOLE ISLAND) وہ کتابیں ہیں جن کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

آپ کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کی سرمایہ داری دنیا کے لئے ایک لعنت ہے اور امیر اور غریب میں جو وسیع خلیج حائل ہے۔ اسکا واحد علاج اشتراکیت (سوشلزم) ہے اس نظریہ کو پیش کرنے کے لئے آپ نے ایک کتاب "چرائے ہوئے جراثیم" (STOLEN BACCILUS)

لکھی ہے۔ ایک شخص سرمایہ داری کے ظلم اور افلاس کی سختی سے تنگ آ کر دنیا کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ کہ اس مرض کا علاج صرف یہ ہے۔ کہ لندن کی تمام آبادی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ وہ ایک ڈاکٹر کی دوکان سے جراثیم کی ایک ٹیوب چرا تا ہے تاکہ اسے پانی کے حوض میں ڈال دے۔ اور اس سے تمام لندن تباہ ہو جائے۔ مگر وہ اس قدر مایوس ہے۔ کہ ٹیوب کھولنے پر اُسے حوض میں ڈالنے کی بجائے خود کھا جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ غریب کے لئے دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

۱۹۲۸ء میں آپ نے آوٹ لائن آف ہسٹری (OUT LINE OF HISTORY.) شائع کی۔ لوگ حیران رہ گئے۔ کہ ایک سائنس دان فلاسفر اور افسانہ نویس کو تاریخ میں بھی کس پایہ کا دخل ہے۔ آپ نے آدم سے شروع کر کے ۱۹۲۰ء تک کے واقعات نہایت خوبی سے قلمبند کئے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب تاریخ کے طالب علم کے لئے چنداں مفید نہیں ہے تاہم عام مطالعہ کے لئے ازبس کار آمد ہے۔

آپ کے اخلاق نہایت اعلےٰ پایہ کے ہیں۔ راقم الحروف کو آپ سے گہری عقیدت ہے۔ اور آپ کے ہمراہ روس کے سفر کا شرف حاصل کر چکا ہے ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے روس میں انقلاب کا زور شور تھا۔ ایک رات ہم پیٹروگریڈ میں ایک ساتھ بہار رہے تھے۔ کہ چند روسیوں نے ہمیں آگھیرا۔ ہمارے کوٹ اور جوتے اتار لئے۔ صبر کے سوا کیا چارہ تھا۔ مگر اس اضطراب کی حالت میں بھی آپ کے ماتھے پر شکن نہ پڑی۔ آپ نے نہایت خندہ پیشانی سے نہ صرف کوٹ اور جوتا اتار دیا۔ بلکہ وہ روپیہ بھی جو آپ کی جیب میں تھا۔ از خود ان لٹیروں کو پیش

کرکے کہا "یہ آپ کے کھانے کے لئے ہے"۔

بیسیوں طالب علم آپ کی فیاضی سے ہر سال فارغ التحصیل ہو رہے ہیں اور بیسیوں گھرانے عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بغداد کے مشہور و معروف خاندان برامکہ ۔ ۔ ۔ ۔ کی طرح آپ کی فیاضی ضرب المثل ہے۔ اور لوگوں کو چھپ کر دینے میں آپ کو ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔

وہ راقم الحروف پر قیام انگلستان کے دوران میں از حد مہربانی فرماتے تھے۔ اب بھی گاہے گاہے اپنے عنایت ناموں سے مشرف فرماتے ہیں۔ چونکہ آپ کے خطوط نہایت دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک خط کا ترجمہ جو حال ہی میں آیا ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے:۔

" لنڈن

۱۹۳۵-۱۰-۱۰ مائی ڈیر حمید

آپ کا خط ملا۔ یاد آوری کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ میں فرانس گیا تھا۔ اس لئے جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی ہے۔ امید ہے۔ آپ اس تاخیر کو نظر انداز کر دینگے۔ تاہم میں اسکے لئے عذر تقصیر کرنا چاہتا ہوں۔

آپ نے اٹلی اور ابی سینیا کی جنگ کے متعلق میرے خیالات دریافت کئے ہیں۔ مدت ہوئی ہے کہ ایک دفعہ ایک کتاب میں کسی جاپانی کی لکھی ہوئی ایک کہانی پڑھی تھی جس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کہانی میں نہایت دلچسپ پیرایہ میں زبردست اور زیردست کا قصہ

بیان کیا گیا ہے۔ ایک شخص کو جو ظالم اور زبردست تھا۔ ایک مظلوم اور زیردست سے قرضہ لینا تھا۔ جب مقروض قرضہ ادا کرنے لگا۔ تو زبردست نے کہا کہ ایک ہزار بارہ سو روپیہ کا ہوتا ہے۔ قہر درویش برجانِ درویش اسے بارہ سو روپیہ فی ہزار کے حساب سے ادا کرنا پڑا۔ اٹلی کا رویہ ابی سینیا کے بارے میں بعینہ وہی ہے۔ آج سرمایہ دار غریب کو کچل رہا ہے۔ اور اس کا واحد علاج سوشلزم ہے۔ چند ہوس پرستوں کی جاہ و حشمت کی کہانی کو قوموں کے عروج کی تاریخ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ابی سینیا سے تجاہل عارفانہ کا برتاؤ ہو رہا ہے۔ جس طرح غریب اور امیر میں مساوات ناممکن ہے۔ اسی طرح طاقت ور اور کمزور میں صلح محال ہے۔ جمعیت الاقوام امیروں اور طاقت وروں کی انجمن ہے۔ غریب اور کم زور کا اس سے کسی قسم کی توقع رکھنا۔ اس کے اپنے دماغ کا قصور ہے۔ حق الیقین ہے کہ اٹلی لڑائی ہار کر بھی کامیاب ہی رہیگا۔ بیسویں صدی میں رنگ و خون کی تمیز بڑھ رہی ہے مذہب کی پرواکرنے والے کم ہیں اور انصاف محض رسمی لفظ رہ گیا ہے۔ یورپ کے مرد مادہ پرستی میں گرفتار ہیں۔ اور عورتیں فیشن اور عریانی کی زبردست رَو میں بہ رہی ہیں۔ نفس پرستی کا دوسرا نام عریانی (NUDISM) ہے۔ میں اس صدی سے بیزار ہوں۔ اور عنقریب اس موضوع پر ایک کتاب سپردِ قلم کرنے والا ہوں مجھے یہ معلوم کرکے نہایت مسرت ہوئی ہے۔ کہ آپ کی کتاب "کمال پاشا" چھپ رہی ہے۔ میں حال ہی میں ان سے ملا ہوں بے شک وہ دُنیا کے بہت بڑے انسان ہیں۔

ایچ - جی - ویلز

مسز ویلز آپ کو یاد کرتی ہیں - اور سلام بھیجتی ہیں -

آپ کا محب صادق

ویلز

ہٹلر

ہٹلر ۲۰ اپریل ۱۸۸۹ء کو آسٹریلیا کے شہر برانو میں پیدا ہوا جہاں اس کا والد محکمہ محصول میں ملازم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اسکا دادا نہایت غریب آدمی تھا۔ اور ان کے خاندان کے حالات اس قدر ناگفتہ بہ تھے۔ کہ ہٹلر کا والد غربت سے تنگ آکر تیرہ سال کی عمر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا اور دوانشا کی راہ لی۔ وہ ایک زمانہ تک محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا رہا۔ سترہ سال کی عمر میں اُس نے دستکاری کا ایک امتحان پاس کر لیا۔ اسکی خواہش تھی کہ اسے کوئی سرکاری ملازمت مل جائے۔ مگر تکلیف اور مصائب کے دن آسانی سے نہیں کٹتے۔ جب اسکا سن ستائیس سال کا ہوا تو وہ اپنی اس خواہش میں کامیاب ہوا اور اُسے محکمہ محصول میں ایک اسامی مل گئی۔ دس سال تک متواتر وہ اپنی اسامی کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔ سینتیس ۳۷ سال کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ وہ اس وقت نیبنس میں مقیم تھا۔ اس نے وہیں کچھ اراضی خرید کر کے کاشت شروع کر دی۔ اسکی عین آرزو تھی۔ کہ اسکے بیٹے کو کوئی معقول سرکاری ملازمت مل جائے۔ مگر بیٹے کا رجحان طبع نقش کشی کیطرف تھا۔ اور اُس نے تہیہ کر رکھا تھا۔ کہ وہ مصوری کو اپنا پیشہ بنائے گا۔ وہ اپنے ارادہ پر اس قدر مصر تھا کہ اسکول میں سوائے تاریخ، جغرافیہ اور نقش کشی کے اس نے کسی اور مضمون کو سیکھنے یا یاد کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔

ہٹلر

حالات بدلتے رہے اور ہٹلر کی طبیعت بھی زمانے کے حادثات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس اثنا میں ایک وہ وقت آیا کہ اسکے دل میں حب الوطنی کے جذبات بھڑکنے لگے اس جذبہ سے متاثر ہو کر اس نے اپنے ملک پر جان نثار کرنے کی ٹھان لی۔ والد کے کتب خانے میں وہ فوجی موضوع پر اکثر کتابیں پڑھتا۔ جب اس نے ۱۸۷۱ء کی لڑائی کی بابت جسمیں جرمنی کو فرانس پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ پڑھا تو اسے بہت مسرت حاصل ہوئی۔ وہ اپنے دل میں کڑھتا۔ کہ آسٹریا کے لوگ جرمنی کے معاملات میں کیوں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ کہتا کہ آسٹرین جرمن کیوں نہیں ہیں؟ اور اس سوال کا بار بار اعادہ کرنے سے اسکے دل کو ٹھیس لگتی۔ اسی وجہ سے وہ آسٹرین سے نفرت کرنے لگا۔

لنیز میں اسکا تاریخ کا استاد ایک جرمن تھا۔ اسکی صحبت نے ہٹلر پر جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ وہ انقلابی ہو گیا۔ اور محسوس کرنے لگا۔ کہ وائنا روز بروز جرمن اثر سے باہر ہو رہا ہے وہ دیکھتا تھا۔ کہ ہیپسبرگ کا خاندان جرمن حب الوطنی کو نیست و نابود کرنا چاہتا ہے۔ اس کی دلی خواہش تھی۔ کہ جرمنی اور آسٹریا کا پرانا رشتہ اور اتحاد پھر قائم ہو جائے۔

اسکے والد کے انتقال کے بعد اسکی والدہ نے یہ خیال قطعی طور پر چھوڑ دیا کہ اسے ملکی حکومت میں کوئی ملازمت مل جائے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹروں نے تشخیص کیا تھا۔ کہ اس کے پھیپھڑے بہت کمزور ہیں۔ اور وہ کبھی دفتر میں کام کرنیکے بالکل ناقابل ہے۔ والد کے انتقال کے دو سال بعد اسکی والدہ اس جہان فانی سے چل بسی۔ اسکے والد کا تمام اندوختہ اس کی والدہ کی بیماری پر ختم ہو گیا۔ وہ دنیا میں بیکس اور لاوارث رہ گیا۔ بحیثیت یتیم ہونے کے جو پنشن

اُسے حکومت کیطرف سے ملی وہ اسکے لئے [illegible] کو برقرار رکھنے کے لئے کافی نہ تھی اسے اپنا پیٹ پالنے کی فکر ہوئی اور وہ عازم وائنا ہوا۔

وائنا پہنچکر اُس نے فنِ مصوری کا امتحان دیا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اُسکو اپنا میلان "فنِ عمارت" کی طرف زیادہ مائل نظر آیا۔ اس لئے اُس نے "صیغہ عمارت" میں داخل ہونیکی ٹھانی لیکن وہاں داخل ہونے کے لئے مڈل کا سرٹیفکیٹ لازمی تھا۔ جو اسکے پاس نہیں تھا۔ اس لئے وہ مایوس ہو کر بطور مزدور خشت سازی کے کام میں مصروف ہو گیا۔

ان ایام میں اسے مارکس اور جمہوری کی کتابوں کو مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اسکی دور بین نگاہ نے تاڑ لیا۔ کہ موجودہ حالات میں دونوں کے اصول جرمنی کے لئے ازحد مضر ہیں وہ تاڑ گیا۔ کہ ٹریڈ یونین یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ من حیث القوم مطلبی اور خود غرض واقع ہوئے ہیں۔

وہ اپنی کتاب "کیمپٹ" میں رقمطراز ہے "میری زندگی کے وہ ایام جو میں نے اپنے والد کے گھر بسر کئے۔ عام لوگوں کیطرح تھے۔ میں زندگی کی کشمکش سے ناواقف تھا۔ میری جوانی کے دن نچلے طبقے میں بسر ہوتے تھے۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ دنیا میں دھوکے اور بددیانتی کا عام چرچا ہے۔ نفس پرستی دنیا کو مٹا رہی ہے۔ اور دنیاوی وجاہت کے لئے بڑی بڑی انجمنوں کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔"

اُس نے محسوس کیا۔ کہ دنیا کی آزادی چھینی جا رہی ہے۔ اور آزادی کے نعرے محض رسمی الفاظ ہیں۔ وہ کڑھتا اور کہتا ہے

ہٹلر

نرسے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

ایک دن وائنا کے بازار میں ہٹلر نے ایک یہودی کو دیکھا جس نے چند مفلوک الحال لوگوں کو قرضہ کے عوض گرفتار کرا یا تھا۔ وہ یہودی کے پاس پہنچا اور پوچھا کہ کیا تم جرمن ہو۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے تو اسکے استعجاب کی کوئی حد نہ رہی وہ اس سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا۔ کہ تم بنی نوع انسان کا خون چوستے ہو۔ تم اس جونک کی مانند ہو جو کسی پر رحم نہیں کرتی اگر قدرت نے مجھے زندگی میں طاقت دی تو میں بنی نوع انسان کو بالعموم اور جرمن قوم کو بالخصوص تمہارے پنجہ سے چھڑانے کی کوشش کرونگا تم لوگ قمار خانوں اور قحبہ خانوں سے روپیہ کمانے سے دریغ نہیں کرتے وہ اپنی کتاب گیمنٹ میں ایک جگہ لکھتا ہے۔ کہ "اگر یہودیوں کو مارکس کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر کامیابی ہو گئی۔ تو میں کہوں گا۔ کہ تمام بنی نوع انسان کا جنازہ نکل گیا۔ اگر یہودیوں کو طاقت حاصل ہو جائے۔ تو انسانوں کی حالت کتوں اور بندروں سے زیادہ خطرناک ہو جائیگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہودی قوم کیخلاف کام کرنا عین منشائے الہٰی اور حق تعالیٰ کی رضا جوئی حاصل کرنا ہے۔ یہودی فطرتاً جھوٹا فریبی مکار اور دغاباز ہے"۔

اسکا یہ خیال ہے۔ کہ یہ کوئی دانائی کی بات نہیں ہے۔ کہ حکومت وہی کام کرے جسے عوام اچھا کہیں۔ عوام بیوقوف واقع ہوئے ہیں اور انکی مرضی کے مطابق چلنا ایک اعلےٰ دماغ سے نہیں ہو سکتا البتہ عوام کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ وہ اپنا لیڈر اپنی مرضی

ہٹلر

سے چنیں۔

۱۹۱۲ء کے موسم بہار میں وہ وائنا سے میونخ پہنچا۔ اسوقت اسکا سن تئیس سال کا تھا۔ اس شہر میں اسکے دل کو تسکین حاصل ہوئی کیونکہ یہاں وائنا کے مقابلہ میں یہودی بہت کم تھے۔ میونخ میں وہ فنِ تعمیر کے کام سے اپنا پیٹ پالنے لگا۔ یہاں اس نے فنِ مصوری میں بہت اچھی دستگاہ پیدا کرلی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ قدرت نے اسے فنِ مصوری کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہاں اس نے سیاسی معاملات میں بھی دخل دینا شروع کیا۔ وہ حیران تھا کہ جرمنوں کو آسٹریوں کے متعلق بہت کم علم ہے۔ جرمن نہیں جانتے کہ آسٹریا اور اٹلی سے انکا معاہدہ خطرناک ہے۔ وہ خیال کرتا کہ جرمن کو نوآبادیات کے مسئلہ میں قطعی طور پر غیر جانبدار رہنا چاہیئے۔ وہ کہتا کہ "انگلستان کی مثال ہم پر عاید نہیں ہوتی۔ انگلستان کی پوزیشن دنیا میں اپنی واحد مثال ہے۔ انگلستان کی زبان وہی ہے جو امریکہ کی ہے اور اسی وجہ سے اسے دنیا کی تمام حکومتوں پر سبقت حاصل ہے۔ جرمنی کے لئے مفید بات یہ ہے کہ وہ انگلستان سے رابطہ اتحاد قائم کرے"۔

۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں جنگ عظیم چھڑ گئی اسے اس سے قلق ہوا۔ اسکا خیال تھا کہ جرمنی کو اس آگ میں نہیں کودنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ اس بات سے خوش تھا کہ آسٹریا اور جرمنی ایک طرف ہیں۔

۳ اگست ۱۹۱۴ء میں اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اسے جنگ میں جانیکی اجازت دی جائے۔ اسکی درخواست منظور کی گئی۔ اور اگلے ہی دن اس نے وردی پہن

لی جسے اس نے چھ سال تک زیب بدن رکھا۔ بسا اوقات میدان کارزار میں اس نے بہادری کے وہ وہ جوہر دکھائے۔ کہ اسکی بہادری کا عام چرچا ہونے لگا۔ ۷ راکتوبر ۱۹۱۶ء کو وہ زخمی ہوکر فوجی ہسپتال میں داخل ہؤا یہاں جب اس نے ایک جرمن نرس کو دیکھا تو اُسے بہت مسرت ہوئی صحتیاب ہونے پر اسے برلن جانیکی اجازت دی گئی۔ مگر وہاں پہنچکر اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تمام دفاتر میں یہودی بھرے ہوئے ہیں اور انہوں نے لوگوں کے گرد جال سا تن رکھا ہے۔ اسے بہت افسوس ہؤا جب اس نے محسوس کیا کہ لوگوں پر لڑائی کا اچھا اثر نہیں ہے۔ اور عوام لڑائی سے بہت خائف اور نالاں ہیں۔

۱۹۱۷ء میں جب اُسے کامل صحت ہوگئی تو پھر فوج میں چلا گیا۔ سال کے اخیر میں روس کا کچومر نکل گیا تھا۔ اسکو پے درپے شکستیں ہوئیں۔ جرمنی کی پھر ڈھارس بندھ گئی۔ مگر یہ حالت چند روزہ تھی۔ ۱۹۱۸ء کے موسم بہار میں فوج کے پچھلے حصوں میں ہڑتال ہوگئی۔ سامانِ جنگ کی اشد کمی تھی۔ اسکا خیال تھا۔ کہ یہ سب مصائب یہودیوں کی وجہ سے پیش آ رہی ہیں۔

۱۴ راکتوبر ۱۹۱۸ء کو جب انگریزی فوجوں نے گیس کا نہایت شاندار حملہ کیا۔ تو وہ پیرس میں تھا۔ وہ بیہوش ہوکر بیحس ہوگیا۔ اور محسوس کرنے لگا۔ کہ اسکی بینائی جاتی رہی ہے۔ اسے ہسپتال میں بھیجا گیا۔ جہاں رفتہ رفتہ اسکی بینائی اور صحت اچھی ہوگئی۔ وہ ابھی ہسپتال میں ہی تھا کہ جرمنی میں نومبر ۱۹۱۸ء کا انقلاب برپا ہوگیا۔ وہ باربار اعادہ کرتا ہے۔ کہ یہ سب کچھ یہودیوں کیوجہ سے پیش آیا۔ جب اُسے جرمنی کی شکست فاش کے متعلق بتایا گیا۔ تو وہ بہت رویا اور کہا۔ یہ ہمتیں، یہ شجاعتیں سب کی سب بیکار گئیں۔ آہ یہودیوں نے مادر وطن کو تباہ کر ڈالا۔

ہٹلر

اس نے تمام واقعات پر ایک نظر ڈالی اور تہیہ کر لیا۔ کہ وہ مادرِ وطن کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو کر یہودیوں کی لعنت ملک کے گلے سے اتارنے کے لئے ہر ممکن سعی کرے گا۔

اس احساس کے ہوتے ہی اُس نے ملک کی حالت پر ایک عمیق نظر ڈالی۔ اُس نے دیکھا کہ مردوں اور عورتوں کے دل میں سوائے ہوس پرستی کے اور کوئی چیز نہیں۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ فوجوں میں بدنظمی کا دور دورہ ہے۔ غنیم کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر تمام قوم جوانمردی کے جوہر کھو رہی ہے۔ مارکس کی تعلیم نے ملک کو وہ نقصان پہنچایا ہے۔ جسکی تلافی قریب قریب ناممکن ہے۔ غلط پالیٹیکس پر چل کر تمام قوم راہِ راست سے بھٹک گئی ہے۔ مرد صنفِ نازک کی تقلید میں اندھا دھند چل رہے ہیں۔ اور عورتوں کی بیباکی سے قوم کے قلبِ حزیں کو ٹھیس لگ رہی ہے۔

ان پرجوش خیالات کو دل میں لئے ہوئے ہٹلر نے ۱۹۱۸ء میں پھر فوج میں مراجعت کی۔ یہاں آکر اُسے معلوم ہوا کہ فوج اشتراکیوں کے ہاتھ میں ہے۔ ۱۹۱۹ء میں کیمپ توڑ دیا گیا۔ اور وہ میونخ چلا گیا۔ یہاں اُس نے انقلاب کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیں اور مظاہرے کئے۔ اس لئے ۲۷ر اپریل کو اسکی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا۔ لیکن وہ سپاہی جو اسکی گرفتاری پر مامور کئے گئے تھے۔ اسکے ہم خیال نکلے۔ اس لئے انہوں نے بجائے گرفتار کرنیکے اس کے لئے بھاگ نکلنے کے وسائل بہم پہنچائے۔ چند دنوں کے بعد انقلابی گورنمنٹ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ہٹلر کو تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا۔ وہ تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک اور پارٹی کا قیام ازحد لازمی ہے۔ اس لئے سوشلسٹ انقلابی پارٹی

کی بنیاد رکھی گئی۔ عوام اور مادر وطن" کی خدمت پارٹی کا نصب العین قرار پایا۔ وہ لکھتا ہے۔ "پارٹی کا واحد مقصد یہ ہے۔ کہ جرمن قوم ترقی کرے۔ ہمارے لوگ آزاد ہوں اور ہمارے بچے فاقوں سے بچ جائیں۔"

ہٹلر ابھی فوج ہی میں تھا۔ کہ حکومت نے اُسے حکم دیا کہ وہ "مزدور پارٹی" کے متعلق معلومات بہم پہنچائے۔" اس مقصد کے لئے وہ انجمن کے ایک اجلاس میں شامل ہوا بمشکل پچیس آدمیوں نے اسمیں شرکت کی تھی۔ وہ سب کے سب ادنے لوگ تھے۔ انہوں نے تجویز کی کہ بویریا اور آسٹریا کا اتحاد والحاق ہو جانے۔ اس پر ہٹلر ناراض ہو کر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہٹلر کو ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے اسی انجمن کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اور اسے بتلایا گیا کہ وہ اس پارٹی کا ممبر چنا گیا ہے۔ اسے اس انتخاب پر حیرت ہوئی تاہم وہ شرکت کے لئے گیا۔ وہاں اس نے دیکھا۔ کہ صرف پانچ اشخاص موجود تھے۔ جن میں ایک صدر اور چار ممبر تھے۔ انجمن کا سرمایہ ساڑھے شلنگ تھا۔ باوجود اس مضطرب حالت کے جو انجمن کی تھی ہٹلر نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اسکا ممبر ہو کر اس کی حالت کو سدھارے گا۔ ہٹلر لکھتا ہے۔

"انجمن کی حالت ناگفتہ بہ تھی مجھکو ملا کر اسکے کل سات ممبر تھے۔ انجمن کے اجلاس میں کوئی شخص شامل نہ ہوتا تھا۔ نہایت تنگ و دو کے بعد چار ممبر اور بنائے گئے اور ایک زمانہ گذرنے کے بعد کل چوبیس ہوئے۔"

ہٹلر کی کوشش سے اسکے سب فوجی دوست اس میں شامل ہو گئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء

میں اسکے ایک سوتیس ممبر تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ہٹلر نے انجمن کے اجلاس میں . . . . . .
ایک دھواں دھار تقریر کی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ اس نے وضاحت کیساتھ بتلایا
کہ انجمن کا مقصد ملک سے یہودیوں کا اخراج اور مارکس کے اصولوں کی مخالفت ہے پارٹی
کا نام تبدیل ہوکر نیشنل سوشلسٹ پارٹی مقرر ہوا۔ اور وہ آج نازی پارٹی کے نام سے مشہور ہے
۱۹۲۰ء میں ایک پبلک ہال میں اس انجمن کا اجلاس ہوا، دو ہزار اشخاص نے شمولیت
کی اجلاس چار گھنٹے تک جاری رہا اور اس نے حب الوطنی کی وہ آگ بھڑکائی کہ پھر کوئی
اسے بجھا نہ سکا،

۱۹۲۴ء میں بغاوت برپا کرنے کے جرم میں ہٹلر کو پانچ سال کی سزا ہوئی۔ لینڈزبرگ
کے قلعہ میں اسے مقید کیا گیا جہاں بویریا کی حکومت جرمن پولیٹیکل قیدیوں کو قید رکھتی تھی۔
ان کی ملاقات وہاں مشہور و معروف جرنیل لینڈراف سے ہوئی جن کی وساطت سے صرف
آٹھ مہینے کے بعد رہا کر دیا گیا۔

قید سے رہائی پاکر وہ حکومت کی پارلیمنٹ کے لئے کھڑا ہوا اور اس کی پارٹی بتیس
نشستوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ۱۹۲۶ء کے اختتام پر ایک لاکھ اشخاص
پارٹی کے ممبر ہو گئے۔ بتدریج ہٹلر کا اثر درسوخ لوگوں کے دلوں میں بڑھ رہا تھا۔ ۱۹۲۷ء
میں تقریباً تمام جرمنی میں وہ مسلمہ لیڈر مانا گیا۔ اور اسی سال ایک اجلاس کے موقع پر ہٹلر
زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے تمام جرمنی کو ہلا دیا۔

اسمیں کلام نہیں کہ اس سے قبل جرمنی میں کوئی ایسا لیڈر نہیں پیدا ہوا تھا جو لوگوں کی

سرشت کو اس خوبی سے سمجھ سکے جس طور پر کہ ہٹلر سمجھتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اسکی پارٹی کے ایک سو سات ممبر پارلیمنٹ میں جسے ریشٹاگ کہتے ہیں۔ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ہمہ تن مصروف تھے۔ ہٹلر کے بہت سے مددگار اس بات کے قائل تھے۔ کہ زبردستی لوگوں کو پارٹی کا ممبر بنایا جائے۔ مگر ہٹلر بذات خود اسکا مخالف تھا۔ چونکہ وہ کہتا تھا کہ کہ ہر کام لوگوں کی مرضی سے ہونا چاہیئے۔ اور اس اصول پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ۱۹۳۲ء میں ہنڈنبرگ ایسی شخصیت کے مقابلہ میں ہٹلر کو صدارت کے لئے چالیس فیصدی کے قریب ووٹ ملے۔ پارٹی اس سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی تھی۔ کہ ۱۹۳۲ء میں فان پپن نے ہٹلر کو وائس چانسلر شپ کی لیکن ہٹلر نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں ہنڈنبرگ کی وفات پر وہ متفقہ طور پر صدر منتخب کیا گیا۔

آج اسکے رسوخ کی یہ حالت ہے۔ کہ اسکی مرضی قوم کی مرضی سمجھی جاتی ہے اور وہ مسلمہ طور پر جرمنی کا لیڈر مانا جاتا ہے۔

اسکا خیال ہے۔ کہ قدرت نے عورت کو اس لئے پیدا نہیں کیا۔ کہ وہ ہر بات میں مرد کی تقلید کرے۔ بیشک وہ صنف نازک ہے اس لئے اسکی زندگی کا نصب العین صرف یہ ہے۔ کہ وہ گھر کی نگہداشت کرے اور گھر کے تمام کام کاج میں خود مختار مطلق ہو۔ وہ عریانی کے سخت خلاف ہے۔ اسلئے اس نے اپنے ملک میں ایسے قانون نافذ کئے ہیں۔ جو عریانی کے سخت خلاف ہیں۔ اس نے یہودیوں کو ملک سے نکال دیا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ قوم دنیا کی آزادی سلب کرنیکی اجارہ دار ہے۔ وہ قطعی طور پر

گوشت نہیں کھاتا۔ نہ تمبا کو پیتا ہے۔ اور نہ شراب کے نزدیک جاتا ہے۔ اسکی عادات نہایت سادہ ہیں۔ اسکے صرف دو" اے۔ ڈی۔ سی" ہیں اور چانسلر کے مکان میں وہ نہایت سکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔ مسٹر وانڈر قمطراز ہیں "میں نے جب سے وہ چانسلر ہوا ہے۔ دو دفعہ اس سے ملاقات کی ہے۔ میں اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسکی عظمت اور شان کا معترف ہوں" وہ لڑائی کے خلاف ہے لیکن برملا کہہ چکا ہے۔ کہ اگر کسی طاقت نے اس پر حملہ کیا تو وہ جرمنی کے خون کا آخری قطرہ جرمنی کی عزت و ناموس کے لئے بہادیگا۔

عبدالعزیز ابنِ سعود

زمانہ کے انقلابات کے ساتھ ساتھ گذشتہ دو صدیوں سے ابن سعود کے خاندان کا اثر جزیرۃ العرب پر گھٹتا اور بڑھتا رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے خاندان مذکور محمدؒ ابن عبدالوہاب کے زیر اثر ہے۔ اور عوام اُسے وہابی کے نام سے ملقب کرتے ہیں۔ ایک وقت میں اس خاندان کا اثر اتنا بڑھ گیا۔ کہ انہوں نے ترکی کی حکومت کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ابراہیم پاشا نے انہیں ایسی شکست دی کہ انکا سب زور ٹوٹ گیا۔ بہرحال اس تحریک کا خاتمہ نہ ہوا کیونکہ یہ وقتاً فوقتاً عرب کے کسی نہ کسی حصہ میں چلتی اور پھولتی رہی۔

انیسویں صدی میں سعود کے خاندان کا اثر پھر بڑھنا شروع ہوا۔ مگر ۱۸۹۰ء میں حکومتِ عثمانیہ نے اس خاندان کے بعض افراد کو نظر بند کر دیا۔ اور بعض کو دور دراز ملکوں میں جلاوطن کر کے انکے اثر کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہا۔ اسی خاندان کے ایک فرد شیخ عبدالرحمٰن نے کویت میں جو خلیج فارس کے کنارے ایک شہر ہے، آکر پناہ لی۔ عبدالرحمٰن کے والد کا نام فیصل تھا۔ اور وہ سعود اکبر کے پوتے تھے۔

عبدالعزیز ابنِ سعود ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں انکے خاندان کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ تقریباً بیس سال تک عبدالعزیز نے نہایت بیکسی اور جلاوطنی کی زندگی بسر کی۔ ان ایام میں اُن کے والد نے انہیں قرآن اور حدیث کی باضابطہ تعلیم دلائی۔

۱۹۰۲ء میں عوام کا خیال تھا کہ جزیرۃ العرب پر وہابیوں کا اثر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ مگر یہ خیال درست نہ تھا۔ عبدالعزیز سعود نے اسی سال اناوبہ میں وہابیوں کی ایک نوآبادی قائم کی۔ وہ اسوقت کویت میں مقیم تھا۔ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ اناوبہ پہنچنے کی ٹھانی۔ وہ ابھی ان خیالات میں مستغرق تھا۔ کہ زائدہ میں جنگ چھڑ گئی۔ عبدالعزیز نے نہایت تندہی کے ساتھ چند ہمراہیوں کو لیکر شہر پر حملہ کر کے قبضہ جما لیا۔ اور خود تخت پر متمکن ہو بیٹھا۔

پہلے چار سال نہایت تنگی اور تکلیف سے گذرے۔ ابن سعود کو ہر روز مدافعت کے لئے جنگ کرنی پڑتی۔ ابن رشید جب اس نے شکست دی تھی۔ تازہ فوجوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ مگر اس کو شکست فاش ہوئی۔ ابن رشید نے ترکوں سے مدد کی درخواست کی۔ ترکی حکومت نے احمد فیضی پاشا کو ابن رشید کی مدد کے لئے مامور کیا۔ وہ ایک جرار لشکر کے ساتھ ابن سعود کی سرکوبی کے لئے نکلا۔ بکیریہ پر دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ ابن سعود نے نہایت سختی سے انکا مقابلہ کیا۔ احمد فیضی پاشا کو کئی لڑائیوں میں ہزیمت اٹھانی پڑی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر چلتا بنا۔ ۱۹۰۶ء میں ابن سعود اور ابن رشید میں ایک خطرناک جنگ ہوئی جسمیں ابن رشید کام آیا۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء کے قلیل عرصہ میں ابن رشید کے تخت پر پانچ بادشاہ متمکن ہوئے۔ اور آخر نابالغ سعد ابن رشید کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اسکے قابل ناظم ابن سبحان نے ابن سعود کے ساتھ مستقل صلح کر کے فتنہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر ڈالا۔ اس صلح کی رو سے ابن سعود کو اختیار دیا گیا۔

کہ وہ جنگجو علاقہ تقسیم میں جس طرح چاہے۔ امن و امان قائم کرکے اپنی سلطنت کی بنیاد ڈال لے۔

ابھی ابن سعود خانہ جنگیوں کو ختم کرکے اپنی سلطنت کی بنیاد ڈال ہی رہا تھا۔ کہ امام یحیٰے پھر امن عامہ میں خلل انداز ہوا۔ اس اثنا میں ٹرکی میں آئینی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور ترکوں نے شریف حسین کو شریف مکہ مقرر کر رکھا تھا۔

عبدالعزیز ابن سعود اپنے کارہائے نمایاں سے ظاہر کر چکے تھے۔ کہ ان میں عربوں کو راہ راست پر لانے کی خداداد قابلیت موجود ہے۔ ۱۹۱۲ء میں اتاویہ میں وہابیوں کا ایک زبردست مرکز قائم ہوا۔ تحریک کا دفتر ایک مسجد میں تھا۔ جو خزانہ عامرہ کے خرچ سے بنائی گئی تھی۔ اس تحریک کے رُوح رواں عثمان بن سلیمان تھے۔ جو آجتک زندہ ہیں۔ اسکے اغراض و مقاصد یہ تھے۔ کہ تمام فرقہ وارانہ اصولوں کو توڑ کر مذہب کو مکروہات سے پاک کیا جائے۔ بادشاہ وقت کی تابعداری کیجائے۔ کھیتی باڑی کو ترقی دی جائے۔ لوگوں کو فوجی تعلیم دلائی جائے اور ہتھیار وغیرہ مفت سلطنت کیطرف سے مہیا کئے جائیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اتاویہ گاؤں سے شہر بن گیا۔ اسکی آبادی دن دوگنی اور رات چوگنی ہونے لگی۔ حتیٰ کہ دس ہزار نفوس پر مشتمل ہو گئی۔ قابل تعریف بات یہ تھی۔ کہ ابن سعود نے بذات خود اسکی نئی آبادی میں ازحد دلچسپی لی۔ نئے مکانات۔ دوکانیں اور بازار طرز جدید پر قائم کرے گئے حفظان صحت کے اصولوں کو خاص طور پہ مدنظر رکھا گیا۔ بوسیدہ مکانات گرا کر انکی جگہ نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں اور قریباً ایک سو سے زاید نو آبادیات اتاویہ کے نمونہ پر چند سال کے اندر اندر معرضِ

وجود میں آگئیں مختلف محکمے قائم کئے گئے۔ قانون اور نظام کے لئے مختلف شعبے بنائے گئے اصول اور ضابطہ کی بنیاد رکھی۔ اور اُن بدوؤں کو جو لوٹ مار کو اپنے ایمان کی ایک شق سمجھتے تھے۔ عمدہ شہری بننے کا وہ سبق دیا۔ جس کی آج وہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

۱۹۱۳ء میں انہوں نے اپنے علاقہ کو ترکوں سے آزاد کرا لیا۔ قسطنطنیہ کی حکومت اس علاقہ کو واپس لینے کی تجاویز پر غور وخوض کر ہی رہی تھی۔ کہ یلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ ترکوں کی توجہ لڑائی کیطرف مبذول ہو گئی۔ اور ابن سعود کو نیست و نابود کرنے کا خیال جاتا رہا۔

۱۹۱۴ء میں کیپٹن شکسپیئر نے جو کویت کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ اتاویہ پہنچکر ابن سعود سے ملاقات کی۔ جنگِ عظیم چھڑ جانے کے بعد کیپٹن مذکور دوبارہ اتاویہ پہنچے اور ابن سعود کو ترکوں کے خلاف ابھارا۔ مگر اس اثنا میں برطانوی حکومت کی توجہ حسین شریف مکہ کیطرف زیادہ مبذول ہو گئی۔ اور کیپٹن کو یہ احساس ہوا کہ ان کے مفاد کے لئے شریف زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہو گا۔ اس لئے ابن سعود کا خیال چھوڑ دیا۔ تاہم ۱۹۱۵ء میں برطانوی حکومت اور ابن سعود کے درمیان ایک عہد نامہ تحریر ہوا۔ جسکی رُو سے حکومت انگلشیہ نے ابن سعود کی بادشاہت کو دوم درجہ کی آزاد سلطنت تسلیم کر لیا۔

ابن سعود کی دوربین نگاہ تاڑ چکی تھی۔ کہ برطانوی حکومت شریف حسین کی وساطت سے حجاز میں ایک حکومت قائم کرنیکا ارادہ رکھتی ہے۔ اسلئے ابن سعود نے موقع کو غنیمت سمجھکر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا عزم بالجزم کر لیا۔ ۱۹۱۹ء میں کیپٹن شکسپیئر ترکوں کیخلاف

ایک لڑائی میں کام آیا۔ لیکن وہ مرنے سے پہلے شریف حسین کی وساطت سے مکہ اور جدہ میں بغاوت برپا کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

ابن رشید کا بیٹا ترکوں کا حامی و مددگار تھا۔ اور انگریزی اقتدار کو خاصا نقصان پہنچا رہا تھا اس لئے ایک انگریزی مشن ابن سعود کے پاس بھیجا گیا۔ کہ وہ ابن رشید کو لڑائی میں مشغول رکھے۔ تاکہ زید ترکوں کی پوری طاقت کیساتھ مدد نہ کرسکے۔ یہ مشن لڑائی کے اختتام تک میں مقیم رہا۔ اور ابن سعود کو یقین دلاتا رہا کہ لڑائی کے بعد انکی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جائیگا۔

جنگ عظیم کے اختتام پر شریف حسین کو حجاز کا بادشاہ بنادیا گیا۔ تو ابن سعود اور شریف حسین کے درمیان کشمکش بڑھنی شروع ہوئی۔ ابتدا میں تو معمولی باتوں میں اختلاف رونما ہوا مگر یہ اختلاف شریف حسین کے لئے نہایت مضر ہوگیا۔ ۱۹۱۵ء سے ابن سعود برطانوی حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ اور جو روپیہ انہیں اس طور سے ملتا۔ وہ اُسے فوج کی ترتیب ہتھیاروں کی خریداری اور ملک کی تنظیم پر خرچ کرتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں لارڈ کرزن نے جھگڑے کا فیصلہ شریف حسین کے حق میں کر دیا۔ اور ابن سعود کو متنبہ کیا گیا۔ کہ اگر وہ فیصلے کو برضاؤ رغبت منظور نہ کریگا تو اسکا وظیفہ بند کر دیا جائیگا۔

ابن سعود نے اسکے جواب میں حجاز پر حملہ کر دیا۔ انگریزی حکومت اپنے حلیف شریف مکہ کی مدد کرنے سے بے بس تھی۔ اسلیئے شریف کیلئے بیرونی امداد کی توقع ملیا میٹ ہوگئی۔ سعودی فوجوں نے مئی ۱۹۱۹ء میں شریف حسین کے بیٹے عبداللہ کو تربہ پر شکست فاش دی۔ اس فتح کے موقع پر ابن سعود نے اپنی خداداد قابلیت ذہانت اور تدبر کا وہ ثبوت دیا جس کی مثال

فی زمانہ عرب کے مدبرین میں مفقود ہے ۱۹۲۰ء میں ابن سعود نے زبیر ۱۹۲۱ء میں سیبل اور ۱۹۲۲ء میں خیبر پر قبضہ جما کر اپنے آپ کو سلطان نجد کے لقب سے ملقب کر لیا۔ ان دنوں عراق عرب کی حدود کا تصفیہ ہو رہا تھا۔ اور انگریز خائف تھے۔ کہ اسمیں رخنہ اندازی نہ ہو۔ اس لئے ابن سعود کو فی الفور سلطان نجد تسلیم کر لیا گیا۔ انگریزی حکومت کا رجحان طبع بجائے باپ کے بیٹے کیطرف زیادہ تھا۔ اس لئے امیر فیصل کو شاہ عراق بنایا گیا۔

۱۹۲۴ء میں انگریزی حکومت نے کوشش کی کہ عرب کے حکمرانوں میں توازن قائم کیا جائے مگر یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ ابن سعود نے ستمبر ۱۹۲۴ء میں پھر حجاز پہ حملہ کیا۔ ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو مکہ کی مسجد میں انکے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اور تمام بیرونی طاقتوں نے انکی بادشاہت کو تسلیم کر لیا۔ شریف مکہ کو اپنی زندگی بچانے کے لئے بھاگنا پڑا۔ اور اس نے جزیرہ سائپرس میں آکر پناہ لی۔ جہاں وہ گمنامی کی زندگی بسر کرتا ہوا راہئی ملک عدم ہوا۔

حجاز کی بادشاہت کے اعلان کے بعد ابن سعود کو احساس ہوا کہ عرب کی تجارتی اور اقتصادی حالت نہایت خراب ہے۔ بدؤوں نے وہ ظلم وستم ڈھا رکھا تھا کہ ناگفتہ بہ ہے۔ انسانی زندگی کی قدر و قیمت پرکاہ کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ قانون اور نظام کے الفاظ انکے لغت میں موجود نہ تھے شریف حسین نے ترکوں کی تمام تعلیمی درسگاہوں اور محکموں کو پامال کر دیا تھا۔ فوج اور پولیس مفقود تھی۔ حکومت کا گذارہ سوائے حج کی آمدنی کے اور کچھ نہ تھا۔ ابن سعود نے سب سے پہلے حاجیوں کے امن وامان کے وسائل پر غور کر کے آسائش کے ذریعے بہم پہنچائے۔ تجارتی۔ معاشرتی۔ اور اقتصادی اصول قائم کئے۔ جہاں زندگی کی قیمت پرکاہ کے برابر نہ سمجھی جاتی تھی۔ وہاں آج پورا

امن و امان ہے۔ کسی کو جرأت نہیں کہ کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ جہاں اونٹوں کا سفر کئی کئی دن میں طے ہوتا تھا۔ آج موٹر پر گھنٹوں میں آدمی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

تار گھر اور ٹیلیفون کا ملک میں جال بچھا ہے۔ مختلف محکمے قائم کر دئے گئے ہیں۔ سونے اور چاندی کے سکے رائج ہیں۔ ہسپتال اور تعلیمی سکول جا بجا قائم ہیں۔ اس ایک معمولی سی مثال سے پتہ چلتا ہے۔ کہ نظم و نسق اعلےٰ پیمانہ پر قائم ہو رہا ہے۔ ایک حاجی کا بستر گم ہو گیا۔ اس کو مالک تک پہنچانے میں حکومت کے ۷۵ روپے خرچ ہوئے۔ مکہ میں ایک بہت بڑا رفاہ خانہ بنایا گیا ہے۔ حکومت قربانی کے گوشت اور کھالوں کے متعلق غور کر رہی ہے۔ بجلی سے مکہ اور مدینہ کو از سر نو منور کیا گیا ہے۔ پکی سڑکیں ہر طرف بنائی جا رہی ہیں۔ جدہ میں جہاں پانی کی ہمیشہ کمی محسوس ہوتی تھی۔ نہایت اعلےٰ پیمانہ پر واٹر ورکس بنایا گیا ہے۔ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے۔ کہ عرب دنیا کے بہترین ملکوں میں شمار ہو گا۔ اسمیں شک نہیں کہ ابھی انہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر ہم یہ بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ان عظیم الشان کارناموں کی ابن سعود نے داغ بیل ڈالدی ہے۔

اس وقت اس کا سن ۵۵ سال کا ہے۔ اس کی سادہ زندگی قابل تقلید ہے وہ رسول خدا کے مزار پر جاروب کشی کرنا اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتا ہے۔ وہ اصلی معنوں میں ملک کا بادشاہ اور خادم ہے۔ توحید الٰہی اس کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک معمولی انسان کی طرح وہ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے شریعت اور قانون کی پابندی وہ انسانی زندگی کے لئے از بس ضروری اور لازمی تصور

گردانتا ہے۔ بعض مغربی اہلِ قلم نے اُس کی باتوں کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ مگر یہ سب کی سب اصلیت پر مبنی نہیں۔ لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے۔ کہ ابنِ سعود نے مزاروں کو منہدم کرنے میں ایک فاش غلطی کی تھی۔ مگر یہی بات ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ انسان ہے اور انسان سے غلطی کا ہو جانا لازمی ہے۔

ہز ہائینس سر محمد شاہ آغا خاں

کپلنگ نے کیا خوب کہا ہے۔"مشرق مشرق ہے مغرب مغرب ہے۔ان میں بعد المشرقین والمغربین ہے۔اور دونوں کی آپس میں کبھی موافقت نہ ہو گی"

لیکن ہز ہائینس سر محمد شاہ کی شخصیت اس اصول سے بالا ہے۔ یورپ میں وہ ایک بہت دولت مند انسان تصور ہوتے ہیں۔ لندن میں انہیں اخلاق کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ اٹلی میں انکے گھوڑوں کی دھوم دھام ہے۔ جنیوا پیرس اور روم میں ان کی حیثیت ایک مدبّر کی ہے اور بہترین مدبران کی بات کو زانوادب تہہ کر کے سننا باعثِ فخر خیال کرتے ہیں۔اور جس محفل میں وہ شمولیت نہ کریں وہ نامکمل سمجھی جاتی ہے۔

ایشیا میں وہ ایک عظیم الشان رہنما مانے جاتے ہیں۔ ایران۔عرب۔ہندوستان۔شام طرابلس الغرب۔زنجبار اور ملایا میں لاکھوں انسان انہیں اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں۔ بعض انہیں دیوتا خیال کرتے ہیں۔ اور کئی ایک انہیں حاضر امام جانتے ہیں۔اور انکی باتیں منجانب اللہ تصور کی جاتی ہیں۔

باوجود اسکے کہ ان کے پاس کوئی فوج نہیں۔ نہ انکی سلطنت ہے۔ تاہم لوگوں کے دلوں پر وہ ایک بہت بڑے بادشاہ کی طرح مسلط ہیں۔

وہ فرگاؤں کے رہنے والے ہیں جو بمبئی کی مضافات میں واقع ہے۔لوگ بغیر چون چرا ان

ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور ہزاروں ان پر قربان ہونا سعادت دارین سمجھتے ہیں۔
رسول خدا کی وفات کے بعد اسلام دو سیاسی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک اہل سنت دوسرا
فرقہ جو حضرت علیؓ کو امام مانتے ہیں۔ شیعوں کے نام سے منسوب ہوتا ہے۔ فرقہ شیعہ
بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہے۔ ان میں ایک اسمٰعیلؓ کے پیرو ہیں۔ جو حضرت
جعفر صادقؓ کے صاحبزادے تھے۔ آغا خاں اسمٰعیل کی اولاد سے ہیں۔ اسلئے فرقہ اسمٰعیلیہ
کے سردار مانے جاتے ہیں۔

آپ کے آباؤ اجداد کا وطن ایران تھا۔ اور وہ ایران کے شاہی خاندان سے ہیں آپ کے
مورث اعلےٰ مشہور و معروف حسن بن صباح تھے۔ جنہوں نے تمام ایران میں ایک تہلکہ بپا کر
رکھا تھا۔ بادشاہ۔ وزراء۔ امراء اور مدبر اسکا نام سنکر کانپتے تھے۔ اسکا قاعدہ تھا کہ وہ
اپنے دشمنوں کے پاس ایک اشرفیوں کی تھیلی اور تلوار بھیجتا۔ جس کا مقصد یہ ہوتا۔ کہ یا تو اشرفیوں
کی تھیلی قبول کر کے اس فرقے کے مداح اور پیرو بن جاؤ۔ ورنہ تلوار تمہارا کام تمام کر دے گی
بیان کیا جاتا ہے۔ کہ نامی نظام الملک اور حسن بن صباح ہم سبق تھے۔ حسن بن صباح کے آدمی
حسب معمول تھیلی اور تلوار لیکر انکے پاس گھر پہنچے۔ انہوں نے تھیلی قبول کر لی اور اس فرقہ کی
تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ لوگوں نے اسکا سبب دریافت کیا۔ تو از راہ ظرافت آپ نے
کہا۔ کہ "انکے اصول بوجھل ہیں اور ان کے دلائل تیز ہیں" الغرض اس فرقہ نے ایک زمانہ تک
محشر بپا رکھا حتیٰ کہ ہلاکو خاں نے انکا قتل عام کر کے ملک کو ان سے نجات دلائی۔ اس
فرقہ کے بعض لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے مصر۔ شام اور ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے

مگر چونکہ خداداد قابلیت انکو خاص طور پر ودیعت ہوئی تھی۔ اس لیئے جہاں کہیں بھی وہ پناہ گزیں ہوئے۔ اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت جلد مشہور و معروف ہو گئے۔ اس قتل عام کے تین سو سال بعد بہت سے خاندانوں نے ایران کو مراجعت کی اور جلد ہی انکا رسوخ و اقتدار پھر بڑھ گیا انیسویں صدی کے وسط میں حسن بن صباح کے خاندان کے ایک فرد محمد حسن نامی کی شاہ ایران کی دختر سے شادی ہوئی۔ انہیں صوبہ محلات کا گورنر بنایا گیا۔ اور شاہ ایران نے انہیں "آغا خاں" کا معزز خطاب مرحمت کیا۔

بادشاہ وقت کی وفات پر محمد حسن آغا خاں نے ایران کی مملکت پر قبضہ کرنیکی کوشش کی مگر اُسے شکست فاش ہوئی۔ اور اُس نے ہندوستان کے صوبہ بمبئی میں آکر پناہ لی جسے انہوں نے اپنا وطن بنالیا۔ وہ مشہور و معروف ہز ہائی نس سر محمد شاہ آغا خاں کے دادا تھے۔

محمد حسن آغا خاں نہایت ذکی متقی اور ہوشیار انسان تھے۔ آناً فاناً لاکھوں خوجے اور ہندو ان کے مرید بن گئے۔ اسمٰعیلیوں کے وہ پہلے امام بنے۔ سلسلہ اس قدر بڑھا کہ چند سالوں میں شام۔ افریقہ۔ زنجبار۔ ایران اور ہندوستان میں انکا اقتدار قائم ہو گیا۔ کروڑوں روپیہ وہ ایران سے ساتھ لائے تھے۔ جو انہوں نے جائداد خریدنے میں صرف کیا۔ انکی دور بین نگاہ نے تاڑ لیا کہ ان کی عافیت برٹش گورنمنٹ کی مدد کرنے میں ہے۔ اسلئے انہوں نے اپنے مریدوں کو خاص احکام جاری کئے۔ کہ وہ حکومت انگلشیہ کی ہر طرح امداد کریں گھوڑوں کا انہیں خاص شوق تھا۔ اور انکے پاس اس کثرت سے نادر گھوڑے موجود تھے۔ کہ دور دراز ملکوں سے لوگ اُن کے اصطبل کو عجائب گھر سمجھ کر دیکھنے کے لئے آتے چند

ہی سالوں میں حکومت بمبئی کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی۔ اور انکا خاص احترام ہونے لگا۔ وہ اکثر چھ گھوڑوں کی گاڑی میں سوار ہو کر اپنے ننھے پوتے محمد شاہ کو ساتھ لیکر نہایت تزک و احتشام سے بمبئی کی گھوڑ دوڑ دیکھنے کے لئے آتے ان کے مرید انکی زیارت نہایت ذوق و شوق سے کرتے اور ان کے استقبال کے لئے اپنی آنکھیں بچھاتے۔ پچاس سال کی عمر میں وہ راہی ملک بقا ہوئے۔ انکی وفات کے تین سال بعد انکا لڑکا بھی اس دارفانی سے چل بسا۔ اس لئے ۱۸۸۵ء میں جب کہ محمد شاہ کا سن صرف آٹھ سال کا تھا۔ اسے آغا خاں بنایا گیا۔ محمد شاہ کی والدہ ایرانی النسل خاص قابلیت کی خاتون تھیں۔ انہوں نے آپ کی تعلیم کے لئے ایک انگریز اتالیق مقرر کیا۔ عربی۔ فارسی اور اردو کے لئے علیحدہ علیحدہ استاد مقرر کئے۔ محمد شاہ فطرتاً نہایت ذکی تھے۔ اس لئے چند ہی سالوں میں انہوں نے شیکسپیئر۔ حافظ اور سعدی کے کلام پر عبور حاصل کر لیا۔ جب انکا سن سولہ سال کا ہوا۔ تو انہوں نے اپنے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور امام مقرر ہوئے دادا سے گھوڑوں کا شوق انہیں ترکہ میں ملا ہے۔ نفاست اور امارت انکی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جب وہ اپنے مریدوں کے ہاں کراچی پونا اور سندھ میں جاتے تو لوگ انکی شان و شوکت دیکھنے کے لئے بیقرار رہتے۔ ان کی شادی شہزادہ سے ہوئی جو ان کے چچا کی لڑکی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے فیاضی سے اس قدر کام لیا۔ کہ چاندی اور سونے کے دریا بہا دئے۔ بیس ہزار آدمی برات میں شامل ہوئے۔ اور تقریب دو لاکھ آدمیوں کو دعوت ولیمہ دی گئی۔

بائیس سال کی عمر میں آپ نے سیاسی امور میں حصہ لینا شروع کیا مسلمان تعلیم میں پیچھے تھے۔ اس لئے وہ اس سے کڑھتے مسلمان تجارت کو اپنے لئے باعث نقصان سمجھتے وہ انہیں اسکی رغبت دلاتے۔ انہوں نے صوبہ بمبئی میں کئی ایک اسکول جن کی تعداد ڈیڑھ سو سے تجاوز کر چکی ہے۔ اپنی گرہ سے کھول رکھے ہیں مسلم یونیورسٹی کی فراہمی چندہ میں آپ نے خصوصیت سے حصہ لیا۔ اور اسے ایک لاکھ روپیہ کا گرانقدر عطیہ آپ نے بذات خود عطا کیا۔ فراہمی چندہ کے لئے انہوں نے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ اور ہر صوبہ میں ان کی وہ آؤ بھگت ہوئی۔ جس کی مثال اس سے قبل مفقود تھی۔

علی گڑھ میں آپ نے فرمایا کہ "مسلمانوں کی تکالیف کا حل اسی میں ہے۔ کہ وہ تعلیم کیطرف رجوع کریں۔ علیگڑھ میں ایک عالیشان یونیورسٹی قائم کریں تاکہ خاص و عام اس سے استفادہ حاصل کریں"۔ وہ ایک ڈیپوٹیشن لیکر لارڈ منٹو کیخدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مسلمانوں کے لئے تعلیم کے وسائل فراخی سے بہم پہنچائے جائیں۔

وہ لبسا اوقات اپنے فرقے کے لوگوں کو درس دیتے۔ کہ سنی اور شیعہ کا سوال عبث ہے ایک دفعہ ان کے چند مریدوں نے تین اشخاص کو اس لئے قتل کر ڈالا۔ کہ انہوں نے سنت الجماعت طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ جب آپ کو معلوم ہوا۔ تو آپ نے قاتلوں کو برادری سے خارج کر ڈالا۔ اور کہا کہ قاتل ہم میں سے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ قرآن کا حکم ہے۔ "اس شخص نے جس نے ارادتاً کسی مسلمان کا قتل کیا۔ اس کی سزا جہنم ہے"۔

آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ہیں۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کے

مستقل طور پر رہنما ہیں۔ آپ اکثر اٹلی۔ فرانس۔ انگلستان اور جرمنی میں اپنا وقت بسر کرتے
دو تین بار ملکہ وکٹوریہ کے مہمان ہوئے۔ جرمنی میں قیصر کے ہاں قیام فرمایا۔ الغرض ایشیا اور
یورپ کے بادشاہ انکی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔

آپ نے اپنی پہلی بیوی شہزادہ کو طلاق دے کر ایک اطالوی خاتون سنتر سے شادی
کرلی شہزادہ علی خاں اسی کے بطن سے ہے۔

انکا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انگریزی حکومت بہترین ہے۔
دوران جنگ عظیم میں انہوں نے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ اور لوگوں کو انگلستان کی مدد کے
لئے ابھارا۔ اپنے مریدوں کو احکام جاری کئے۔ کہ وہ جان اور مال سے حکومت کی مدد کریں
اور بذات خود بطور سپاہی اپنی خدمات پیش کیں۔ ان خدمات کے عوض انہیں گیارہ توپوں
کی سلامی اور رولنگ پرنس کا رتبہ مرحمت ہوا۔

اگرچہ انکے اور حکومت کے مابین نظریہ میں کچھ اختلاف واقع ہو گیا۔ وہ انگریزی حکومت
کے تو حامی تھے۔ مگر اس حکمت عملی کے جو مشرق میں استعمال کی جارہی تھی سخت مخالف
تھے۔ انکا خیال تھا کہ انگریزی حکومت کی بقا کے لئے یہ ازبس ضروری ہے۔ کہ ترکی
حکومت کو مضبوط کیا جائے۔ ایران اور کابل کو خالی کر دیا جائے۔ عراق اور بیت المقدس
میں جمہوری حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ اس مقصد کی تعمیل کے لئے انہوں نے انگریزی
پریس میں مضمون شائع کئے۔ مگر ان کے اس رویہ پر بہت سے دی ہوئی۔ لندن میں انکے
خلاف بہت مضمون لکھے گئے۔ بعض انگریزی اخباروں نے لکھا۔ کہ انہیں ہمارے معاملہ

میں مداخلت کا کیا حق ہے۔ اور وہ کون ہیں جو ہمیں ترکوں کی حمایت کے لئے مجبور کریں۔ مگر وہ علی الاعلان کہتے کہ انگریزوں کی بہتری ترکوں کی بقا میں ہے۔ انگلستان اور ہندوستان لازم وملزوم ممالک ہیں اور ایک کا گذر دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔

ان کا کروڑہا روپیہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے تجارتی کاموں میں لگا ہوا ہے انکے گھوڑ دوڑ کے اصطبل فرانس اور انگلستان میں مشہور ہیں۔ ان کے گھوڑوں کی تعریف میں یورپ اور امریکہ کے اخبار رطب اللسان ہیں۔ آپ کو یورپین فلسفہ اور پولیٹیکل تحقیقات میں ایک خاص دخل ہے اور ان ہر دو مضامین میں آپ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔

جب آپکی اطالوی بیوی مسز انتقال کر گئی۔ تو آپ نے کریان نامی ایک خاتون سے جو فرانس کی رہنے والی ہیں، شادی کر لی جسکے بطن سے ایک لڑکا ہے۔

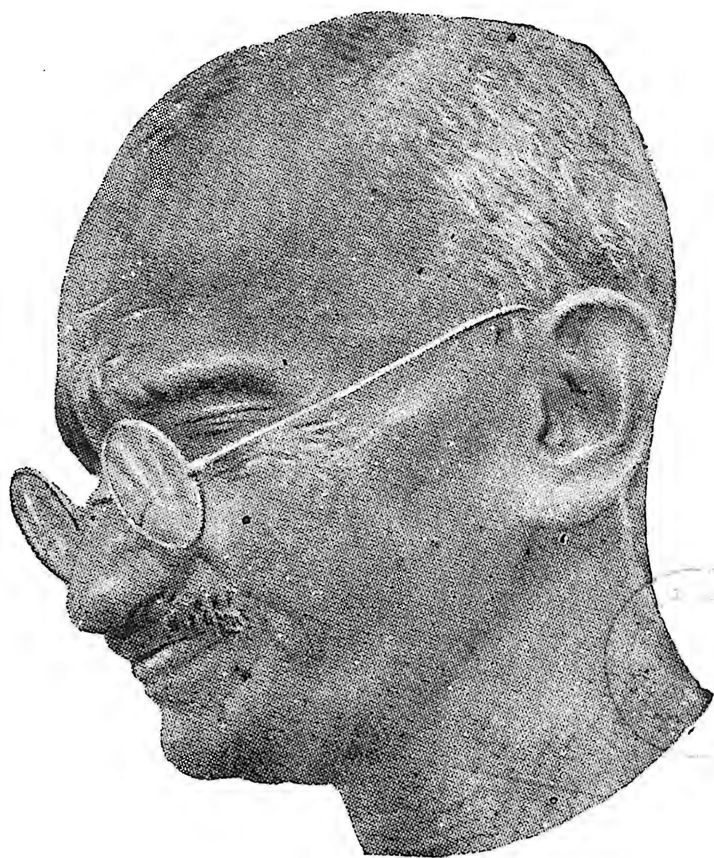
وہ ہر سال کئی دفعہ ہندوستان آتے ہیں ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں وہ ہندوستانی مسلمانوں کے رہنما اور نمائندے مانے گئے ۱۹۳۲ء کی جمعیت الاقوام میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ ہر سال کروڑہا روپیہ افریقہ۔ ملایا سٹیٹ اور ایشیا وسط سے خچروں پر لاد کر بغیر کسی فوج یا محافظ کے انہیں بھیجا جاتا ہے کسی راہزن و قزاق کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اسکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے کیونکہ ہز ہائینس سر محمد شاہ امام حاضر کی تقدس منزلت ان کے دلوں پر مسلط ہے۔

مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی کی شخصیت نے لوگوں کو ایک عظیم ہیجان میں ڈال دیا ہے۔ بعضوں نے اسکا مسیح اور سقراط سے مقابلہ کیا۔ کسی نے اُسے فلسفی کہا۔ کوئی اسے شہید سمجھا۔ کسی نے اُسے انقلابی ٹھہرایا۔ بہر حال یہ عقدہ حل نہ ہوا۔ کہ وہ کیا ہے۔

ایک پست قد کے نحیف البدن انسان نے چرخہ پر سُوت کات کر لوگوں کو یقین دلایا۔ کہ ان کی مشکل صرف اسی کل سے حل ہو سکتی ہے۔ اور سائنس کے تمام اصول اس چرخہ کے سامنے مات ہیں۔ چالیس برس کے عرصہ میں اس شخص نے حکومت سے صرف چار سال تعاون اس خیال سے کیا۔ کہ اس کے ملک کو فائدہ پہنچیگا۔ مگر دُوسرے اصولوں کی طرح اسے یہ بھی سراب نظر آیا۔

کرم چند گاندھی دو اکتوبر ۱۸۶۹ء کو کاٹھیاواڑ کی ریاست پوربندر میں پیدا ہوا۔ وہ ویش خاندان سے تھا۔ اسکی طفلی کے دن ایک چار منزلہ مکان میں گذرے۔ اسکا سن سات سال تھا۔ کہ اسکے والد کو جو ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ مہاراجہ کے عتاب کیوجہ سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو کر پوربندر سے سو میل پر شمال کیطرف ایک شہر راجکوٹ میں مقیم ہو گئے۔ وہاں گاندھی کو ایک ورنیکولر سکول میں داخل کرایا گیا۔ جہاں سترہ سال کی عمر میں انہوں نے انٹرنس پاس کیا۔ انکا اپنا بیان



ہے۔ کہ سکول کے ایام میں وہ ایک سادہ طبیعت کے شرمیلے اور غصیلے لڑکے تھے انکے لڑکپن کے ایک واقعہ سے صاف پتہ چلتا ہے۔ کہ قدرت نے آغاز ہی سے راستی کا وافر حصّہ انہیں ودیعت کیا تھا۔ قرضہ اتارنے کے لئے انہوں نے اپنے بھائی کا طلائی زیور چرا لیا۔ اور جب ضمیر نے ملامت کی تو باپ کے پاس جا کر اقبال جرم کر لیا۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ عدم تشدد کا اصول اقبال جرم کے بعد میرے ذہن میں نہایت وضاحت سے جاگزیں ہو گیا۔

انٹرس پاس کرنیکے کچھ عرصہ بعد ۱۸۸۸ء میں وہ عازم انگلستان ہوئے۔ فن تقریر ناچ، ستار اور فرانسیسی سیکھنے کا شوق انہیں کشاں کشاں رقص و سرود اور علم ادب کی محفلوں میں لیئے پھرا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد یہ سودا انکے سر سے نکل گیا۔ کہ قدرت نے انہیں ان کاموں کے لئے پیدا ہی نہیں کیا۔ ان سب باتوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ قانون کے مطالعہ میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ قانون ریل پراپرٹی میں انہیں خاص شغف تھا۔ ان ہی ایام میں انجیل اور بھاگوت گیتا نے انکی طبیعت کو اپنی طرف جذب کر لیا۔ ۱۸۹۱ء میں انہیں بیرسٹری کی سند مل گئی۔ دو سال تک وہ راجکوٹ میں بطور بیرسٹر کام کرتے رہے۔ ۱۸۹۳ء میں ایک ہندوستانی فرم نے انہیں افریقہ بھیجا۔ کہ وہ ان کے مقدمہ کی وہاں جا کر پیروی کریں۔

یہ وہ وقت تھا جب انکی زندگی میں ایک تغیر واقع ہوا۔ افریقہ کی نوآبادی میں ہندوستانی نوآبادوں کی تکالیف بڑھ رہی تھیں۔ علاوہ بریں ان ہندوستانی وکلا

ڈاکٹر اور تاجروں سے جو وہاں مقیم تھے۔ رواداری کا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ انہیں عمدہ قہوہ خانوں میں داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ ان کے لئے ریلوے کے درجہ اوّل میں سفر کرنا منع تھا۔ یورپ سپاہیوں نے "پریٹوریا ہاؤس" میں گاندھی کو داخل نہ ہونے دیا اور ٹھوکریں مار مار کر باہر نکال دیا۔ گاندھی نے عدم تشدد پر عمل کر کے بجائے ایک گال کے دوسرا بھی پیش کر دیا اور دنیا پر روشن کر دیا۔ کہ زیردست زبردست پر غالب آسکتا ہے۔

ان ایام میں گاندھی نے کارلائل۔ رسکن اور میکس مولر کی تصانیف کا بنظر عمیق مطالعہ کیا۔ انہوں نے رسکن اور نطشے کو غور سے پڑھا۔ مگر ٹالسٹائی کی تصانیف کا ان کی طبیعت پر خوشگوار اثر نہ ہوا۔

ابھی انہیں افریقہ میں قیام پذیر ہوئے ایک سال ہی گذرا تھا۔ کہ انہوں نے ہندوستان کو مراجعت کا تہیہ کر لیا۔ مگر جب انہیں پتہ چلا۔ کہ ہندوستانیوں کی تکالیف افریقہ میں دن بدن بڑھ رہی ہیں تو اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

۱۸۹۶ء میں وہ تھوڑے عرصہ کے لئے ہندوستان آئے۔ جہاں پہلی دفعہ انکی ملاقات سر فیروز شاہ مہتہ۔ گوکھلے اور تلک سے ہوئی گوکھلے کے حسن اخلاق سے وہ بہت متاثر ہوئے اور اپنے تئیں فخر سے ان کے مرید کہنے لگے۔ تلک کے اصولوں سے انہیں اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف دن بدن بڑھتا رہا۔ ایک دفعہ تلک نے گاندھی سے کہا۔ "بیشک تم ہندوستان کے لائق سپوت ہو اور مادر وطن سے

تمہیں عشق ہے۔ سچائی تمہاری طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اگر تم کو ان دونوں میں تمیز کرنی پڑے۔ تو کس کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کروگے؟ گاندھی نے بلا تامل کہا "سچائی کے حق میں"

۱۸۹۶ء کے آخیر میں وہ افریقہ لوٹ گئے۔ اب کے انہوں نے بطور وکیل۔ ایڈیٹر اور انقلابی کے کام شروع کیا۔ وہاں کانگرس کی ایک شاخ قائم کی۔ اور ایک اخبار کا اجرا کیا۔ اخبار کا بھاری خسارہ اپنی گرہ سے ادا کرتے۔ جب بوئر وں سے لڑائی چھڑی تو آپ نے مجروحین کے لئے ایک طبی مشن تیار کیا۔ انہوں نے اس طور پر انگریزی حکومت کی خدمات انجام دیں کہ سرکاری کاغذات میں انکا خاص طور پر ذکر ہوا۔

۱۹۰۱ء میں وہ پھر ہندوستان آئے۔ یہاں کے حالات کا مشاہدہ کرکے ان کی طبیعت میں ایک ہیجان اور اضطراب پیدا ہوا۔ ریلوے کے تیسرے درجہ میں وہ عوام کی تکالیف دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ کالی کے مندر سے قربانیوں کی خون کی ندیاں بہتے دیکھ کر بہت مضطر ہوئے۔ بنارس کے مقدس شہر سے ان کو نفرت و حقارت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس سال کانگرس کے اجلاس میں شمولیت کی اور ۱۹۰۲ء میں پھر افریقہ واپس چلے گئے۔

افریقہ میں ہندوستانیوں کی سیاسی حالت پہلے سے زیادہ ابتر ہو رہی تھی۔ اس لئے وہ زیادہ مستعدی کے ساتھ خدمت کے لئے ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ زیادہ مصروفیت سے انکی صحت بگڑ گئی۔ انہیں اکثر سر درد کا دورہ رہنے لگا۔ اس لئے انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ پھلوں اور دودھ پر زندگی بسر کریں۔ مگر کچھ وقت کے بعد انہوں نے حلف لیا۔ کہ وہ دودھ

کے قریب نہ جائیں گے۔ مگر بیوی کے اصرار پر طے پایا۔ کہ وہ بکری کا دودھ استعمال کر لیا کریں گے۔

۱۹۰۶ء میں زولوں نے بغاوت برپا کر دی اگرچہ ان کی ہمدردی باغیوں کے ساتھ تھی مگر بھی مشن تیار کر کے حکومت کی شاندار خدمات انجام دیں ۱۹۰۸ء میں حکومت افریقہ نے ایک قانون نافذ کیا۔ کہ ٹرانسوال میں داخل ہونے کے ہندوستانیوں کو خاص اجازت لینی ہوگی انہوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے باقاعدہ بغاوت شروع کی۔ ہزارہا ہندوستانی اس جرم کی پاداش میں جیل بھیجے گئے۔ گاندھی ان کی بیوی اور دو لڑکے ٹرانسوال میں بغیر اجازت داخل ہوئے۔ اور قانون توڑنے کے جرم میں مقید کئے گئے۔ یہ انقلابی پروپیگنڈا ۱۹۱۴ء تک جاری رہا حتیٰ کہ جنرل سمٹ کے ساتھ ان کا عہد نامہ ہو گیا اور وہ تمام قوانین جو ایشیائیوں کے خلاف تھے منسوخ کئے گئے۔ افریقہ میں اسکا کام ختم ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے ہندوستان براستہ لندن آنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ جنگ عظیم چھڑنے کے ایک ہفتہ بعد لندن پہنچے۔ جہاں وہ سخت بیمار ہو گئے۔ جنوری ۱۹۱۵ء کو ساحل ہندوستان پر قدم رکھا۔ بمبئی میں گورنر لارڈ ولنگڈن نے انہیں "قیصر ہند" کا تمغہ عطا کیا۔ اور ان سے عہد لیا کہ بغیر گورنمنٹ کو مطلع کئے وہ کسی تحریک میں حصہ نہ لیں گے۔

گاندھی مسٹر گوکھلے آنجہانی سے ملنے کے لئے گئے۔ موخر الذکر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بغیر حالات کو بنظر عمیق مطالعہ کرنے کے کسی تحریک میں دخل نہ دے۔ مسٹر گوکھلے نے ان کو ایک رقم پیش کی۔ جو مشہور و معروف آشرم کے بنانے میں صرف ہوئی۔ انہوں نے

حالات وکوائف کا مطالعہ کرنے کے لئے تمام ہندوستان کا سفر کیا۔ کلکتہ میں انکی ملاقات انقلابیوں سے ہوئی جو تشدد پر عمل پیرا ہونا چاہتے تھے۔ مگر گاندھی کے پند و نصائح سے یہ جوشیلی طبیعتیں پر سکون ہو گئیں۔

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہو گئی۔ اسی سال اتفاق سے رولٹ ایکٹ کے خلاف ایک عظیم صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ ہندوستانی مسلمان ترکی کے حصے بخرے کرنے پر نہایت غم وغصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ پنجاب میں مارشل لاء نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا ان سب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے گاندھی کو میدان کارزار میں کودنا پڑا۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی نے دوسرے کانگرسی لیڈروں کی رفاقت سے عدم تعاون شروع کیا۔ کئی ایک کانگرسی گورنمنٹ کے عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔ طلباء نے سکول چھوڑ دئے ہندو اور مسلمان میں اتفاق کا خوب چرچا ہوا۔ مگر مدراس میں موپلاؤں کی شورش سے دونوں قوموں کے سر سے "یک جہتی اور اتفاق" کا نشہ ہرن کر دیا

گاندھی نے ایک پروگرام وضع کیا جسے کانگرسی لیڈروں نے ناپسند کیا۔ اسمیں شک نہیں کہ پروگرام نہایت ارفع و اعلےٰ تھا۔ مگر تھا ناقابل عمل اور صرف کاغذ پر لکھا ہی اچھا معلوم ہوتا تھا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں چند ہندوستانیوں نے نہایت سفاکی کے ساتھ پولیس کے چند آدمیوں کو جلا دیا۔ گاندھی نے فوراً عدم تعاون کو منسوخ کر دیا۔ کانگرسیوں نے اسکی ازحد مخالفت کی۔ مگر گاندھی کے مقابلہ میں ان کی کون سنتا ہے۔

اپریل ۱۹۲۲ء میں گاندھی کے خلاف مقدمہ بنایا گیا جس میں انہوں نے جرم کا اقبال کیا۔ ان کو چھ سال کی سزا ہوئی۔ اور یروداجیل انہیں رکھا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں ان کو غیر مشروط رہائی دی گئی کیونکہ عمل جراحی ان کی صحت کے لئے ازبس لازمی تھا۔

رہا ہونے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ بائیکاٹ کا قلع قمع ہو چکا ہے۔ ہندو مسلمان میں نا اتفاقی کی وسیع خلیج حائل ہے۔ کھدر کا کاتنا یا پہننا مفقود ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف ہیں۔ ان کی تمام تجاویز ختم ہو چکی ہیں اور ہر طرف مایوسی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ تو سوائے اسکے کیا چارہ تھا کہ اکیس روز کا روزہ رکھ کر اپنے ناتوان قلب حزیں کی تسکین کریں۔

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک واقعات میں تغیر و تبدیل ہوتا رہا کانگریس کی عنان اور لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ سن ۱۹۲۶ء میں وائسرائے کے اعلان پر کہ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دیا جائے گا۔ پچ پنگ ودو شروع ہوگئی۔ انگلستان میں اس اعلان پر لے دی ہوئی۔ ہندوستان میں اس نکتہ چینی کو شبہ کی نظر سے دیکھا گیا حتٰے کہ سن ۱۹۳۰ء کانگریس نے درجہ نوآبادیات لینے سے انکار کر دیا۔ اور ایک قرارداد کے ذریعے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔

عدم تعاون کے حق میں پھر ایک قرارداد منظور کی گئی۔ مگر گاندھی نے آخری بار وائسرائے سے مل کر اس دشوار کام کے تصفیہ کا اقرار کیا۔ انہوں نے وائسرائے کو یقین دلایا کہ وہ عدم تعاون کو منسوخ کرا دینگے۔ بشرطیکہ حکومت نمک کا محصول معاف کر دے شراب اور بدیشی اشیاء بیچنے والوں کی دکانوں پر پکٹنگ لگانے والوں کو قانون کی زد میں نہ لائے۔ مگر حکومت ان شرائط کو کب منظور کر سکتی تھی۔

جب حکومت نے ان شرائط کو مسترد کر دیا۔ تو گاندھی ایک بہادر سپاہی کی طرح قانون توڑنے کے لئے سمندر کی طرف بڑھے۔ احاطہ بمبئی میں کئی ایک جگہ نمک بنایا گیا۔ بدیشی اشیائ بیچنے والی دوکانوں پہ پہرہ لگایا گیا۔ انکا اثر دن بدن بڑھنے لگا۔ اور انہیں وہ اقتدار حاصل ہوا کہ اس سے قبل کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ ۴ مئی ۱۹۳۰ء کو حکومت نے انہیں پھر یرودا جیل میں نظر بند کر دیا۔ جون میں سائمن کمیشن رپورٹ شائع ہوئی۔ لوگ جوق در جوق جیلوں میں جانے لگے۔ پردہ دار عورتیں پردوں سے نکل کر قانون شکنی کرنے لگیں۔ حکومت نے گاندھی سے جیل میں گفت و شنید شروع کی حتیٰ کہ مارچ ۱۹۳۱ء کو دہلی میں لارڈ ارون نے ایک معاہدہ کیا۔ جس کی رو سے گاندھی نے اقرار کیا۔ کہ وہ عدم تعاون کی تحریک کو کچھ عرصہ کے لئے منسوخ کر دینگے۔ اور حکومت ان تمام فرمانوں کو جو عدم تعاون کی تحریک کو ختم کرنے کے لئے جاری ہوئے تھے۔ واپس لے لیگی۔

باوجود کانگرس کی انتہائی مخالفت کے ستمبر ۱۹۳۱ء میں گاندھی نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی گاندھی کا خیال تھا کہ اسمیں ہندوستان کے آیندہ آئین پر بحث و تمحیص ہوگی۔ مگر وہاں فرقوں کی نشستوں کے متعلق بحث ہوئی۔ اور مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اعلان کیا۔ کہ اچھوتوں کو کونسلوں میں علیحدہ نشستیں دی جائیں گی۔ اس اعلان پر گاندھی بہت برہم ہوئے اور کہا کہ اسکی مخالفت میں اپنے لہو کا آخری قطرہ بھی بہا دوں گا۔ چار جنوری ۱۹۳۲ء کو جب وہ ہندوستان پہنچے صرف چھ ہی دن ہوتے تھے۔ کہ حکومت نے انہیں گرفتار کر کے پھر یرودا جیل میں مقید کر دیا۔

آٹھ ماہ یوں ہی گذر گئے۔ وہ کہتے ہیں ہندوستان کی آزادی کو اچھوتوں کے مفاد کے لئے قربان کرنے کو تیار ہوں۔ میں ان کا نمائندہ ہوں۔ اور انکی خاطر اپنی جان دینے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ آخر میں ستمبر کو انہوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی چھ دن کے بعد ان کی حالت نہایت نازک ہو گئی۔ حتے کہ ہندوؤں اور اچھوتوں میں ایک معاہدہ ہو گیا۔ جس کی رو سے اول الذکر نے موخر الذکر کے ماتھے سے کلنک کا ٹیکہ مٹا دینے کا وعدہ کیا۔ مشرقی اور شمالی ہندوستان میں سینکڑوں مندروں میں اچھوتوں کو آنیکی اجازت مل گئی۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد انہیں جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اب وہ ہندوستان کی بہتری کا خیال بھول کر صرف اچھوتوں کو ابھارنے کے کام میں مشغول ہیں۔ عوام میں ان کا اثر زائل ہو چکا ہے۔ اور اب وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پریذیڈنٹ ڈی ولیرا

عہد حاضر کی برطانوی شخصیتوں میں سے ڈی ولیرا کو سب سے زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے متعلق حالات کو اس قدر توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اس میں راستی۔ پاکبازی اور جمہوریت کے اصول کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ وہ کبھی بھی اپنے زاویہ نگاہ کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ نہایت سکون سے بحث و تمحیص کر کے اپنے مخالفوں کو قائل کر لیتا ہے۔ ڈی ولیرا میں قدرت نے خاص لیاقت جمہوریت کے متعلق ودیعت کی ہے۔ اسکی اوائل عمر سے خواہش رہی ہے۔ کہ وہ اپنی جان مادر وطن کے لئے قربان کر سکے۔ اس کی انتہائی کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کے لئے بطور مہربان باپ اور گڈریے کے زندگی بسر کرے۔

۱۹۱۶ء تک اسکے متعلق بہت کم معلوم تھا۔ پچاس سال سے کچھ زائد عرصہ گذرا۔ کہ وہ نیویارک میں آئرش النسل ماں کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کا باپ ہسپانیہ کا رہنے والا تھا جب اس کا سن تین سال کا تھا۔ تو اُسے تربیت کے لئے ماموں کے پاس بھیجا گیا۔ وہ ایک بے بضاعت غریب کسان تھا۔ اس نے رائل یونیورسٹی سے ریاضی میں وظیفہ حاصل کیا اور فارغ التحصیل ہو کر مختلف کالجوں میں بطور معلم ریاضی کا کام کرتا رہا۔

اوائل عمر ہی سے وہ نہایت ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ حب الوطنی کا جذبہ اسمیں بخصوصیت سے

نمایاں تھا۔ اس لئے جب جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ تو یہ صاف عیاں تھا کہ اس نوجوان کا مستقبل
یا تو نہایت روشن ہے۔ یا موت کی وادی میں تقدیر اُسے دھکیل رہی ہے۔

بقول ٹالسٹائی بڑی بڑی شخصیتیں شطرنج کے پیادہ کی طرح بغیر کسی کوشش کے دھکیلی
جاتی ہیں ۱۹۱۶ء تک ڈی ولیرا سے کسی ایسے واقعہ کا ظہور نہیں ہوا جس سے یہ سمجھا جائے۔
کہ قدرت نے ذہانت کے ساتھ فوجی قابلیت بھی ان کو ودیعت کی ہے۔ اگرچہ ۱۹۱۳ء
میں وہ آئرش والنٹیئرز میں بھی بھرتی ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ کمانڈر کے عہدہ پر فائز ہو چکا تھا مگر
یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے خاص قابلیت پر محمول کیا جائے۔

۱۹۱۶ء کی بغاوت کے متعلق یہ کہنا غلط ہوگا۔ کہ وہ سوچ سمجھ کر معرضِ وجود میں لائی گئی تھی۔
بغاوت کے ناخداؤں کو یہ اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ یہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ محض ایک اتفاق تھا
کہ ڈی ولیرا کے ذمہ نہایت اہم اور ضروری کام سپرد کیا گیا۔ اسے اس سڑک پر لگایا۔ جہاں
سے انگلستان کی فوجیں آتی تھیں۔ اور یہ عجیب بات ہے۔ کہ باوجود اسکے کہ وہ ناتجربہ کار تھا
اس سے وہ واقعات ظہور میں آئے۔ کہ تجربہ کار جرنیل انگشت بدندان رہ گئے۔ ایک انگریزی
کرنیل کا بیان ہے۔ کہ اگر تمام افسر ڈی ولیرا کی قابلیت کے ہوتے تو بغاوت کا کامیاب ہونا
یقینی تھا۔ ڈی ولیرا ہی نے شیروڈ فوج کو شکست فاش دی تھی۔

اس دوران میں یہ لانبے قد کا ذہین انسان گھر کے بنے ہوئے لباس میں ملبوس عینک
لگائے زندگی کی ایک پُر اسرار لہر معلوم ہوتا۔ اپنے کلام اور افعال کی برقی طاقت سے اپنے
ساتھیوں کو گداز کر دیتا۔ بسا اوقات اسکی زندگی سخت خطرہ میں گھر جاتی۔ مگر اس کا ایمان

ذاتِ واحد پر اس قدر مضبوط ہے کہ وہ کبھی بھی اس سے لرزہ براندام نہ ہوتا۔ وہ کہتا زندگی خدا کی دی ہوئی ہے۔ اگر مجھے اس طرح مرنا ہے تو کوئی طاقت مجھے بچا نہیں سکتی۔ کل نہ سہی آج سہی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی وہ ہے جو ملک اور ملت کے کام آئے۔ وہ لڑائی اس لئے نہیں لڑا تھا کہ ملک کی اپنی حکومت ہو جائے۔ بلکہ وہ اپنی جان اس لئے ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔ کہ لوگوں میں کھوئی ہوئی غیرت و حمیت واپس آجائے۔

ہفتہ کے دن دو بجے دوپہر کو والنٹیئرز نے جو ڈاکخانہ میں محصور تھے ہتھیار ڈال دیئے ڈی ویلرا نے اتوار تک اطاعت قبول نہ کی۔ اور جب کی تو وہ بھی اپنی مرضی کے خلاف۔ وہ کھلم کھلا اپنے سپاہیوں کے ساتھ گلی میں نکل آیا۔ اسے اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ کہ اُسے کیا پیش آنے والا ہے۔ اس کی توقع کے عین مطابق سزائے موت اس کے لئے تجویز کی گئی۔

ہر صبح وہ لیڈر جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ گروہوں کے گروہ گولی کا نشانہ بنائے جاتے۔ پھر ایک دفعہ قدرت نے اس کی مدد کی۔ اور بغیر کسی تگ و دو کے اس کی جان بخشی کی گئی کیونکہ وہ امریکن رعیت تھا۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں بند سینٹ اگسٹائن کا اقبالِ جرم پڑھ رہا تھا جبکہ قاصد نے اس کی جان بخشی کی خبر اسے سنائی۔ اس نے نہایت لاپرواہی اور سکون سے قاصد کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنی کتاب میں محو ہو گیا۔ مادر وطن کی محبت کبھی بھی اس کے دل سے نہیں مٹی تھی۔ اب اس نے عزم بالجزم کر لیا۔ کہ آزاد ہو کر وہ پہلے سے زیادہ تندہی کے ساتھ ملک کی خدمت بجا لائے گا۔ لوگوں کو اس کے حالات و کوائف سے واقفیت نہ تھی۔ وہ نہ جانتے تھے۔ کہ وہ کس خمیر سے بنا ہوا ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ وہ ایک بیوقوف متلون مزاج آدمی ہے۔ وہ سمجھے کہ وہ

ہوائی قلعے بنانے والا انسان ہے۔ اور ایک لغو معلم ہے۔ جس نے بغاوت میں حصہ لے کر اپنی جان جوکھوں میں ڈال رکھی ہے۔

چند دنوں کے بعد اس کی موت کی سزا حبس عبور دوام سے بدل گئی۔ پہلے پہل اسے ڈارٹ مور کی جیل میں رکھا گیا۔ پھر اسے لوئس میں منتقل کیا گیا۔ آئرلینڈ میں اس کی قید کے بعد ایک ایسا سکوت چھا گیا گویا کہ طوفان کبھی برپا ہی نہ ہوا تھا۔ لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ ابھی اصل طوفان آیا ہی نہیں۔ جیل میں ڈی ویرا اُن آئرش قیدیوں کا سردار مقرر ہوا جو بغاوت کے سلسلہ میں مقید تھے۔ اور ایک دفعہ پھر واقعات اسے یقین دلا رہے تھے۔ کہ وہ عنقریب ملک کا رہنما ہونے والا ہے۔ مائیکل کالن اور آرتھر گرفتھ کو رہا کیا گیا۔ انہوں نے آئرلینڈ کی طرف مراجعت کی۔ مگر بجائے لیڈر ہونے کے وہ اپنے آپ کو ڈی ویرا کے پیرو اور قاصد سمجھتے تھے۔

اس اثنا میں ڈی ویرا نے جیل میں قیدیوں سے بغاوت برپا کرا دی کیونکہ اُن سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کا نام دن بدن مشہور ہونے لگا۔ اور اسے وہ طاقت اور عظمت دی گئی گویا کہ وہ الف لیلہ کے ایک قصے کا ہیرو ہے۔

جون ۱۹۱۷ء میں اسے مع اُس کے ساتھیوں کے رہا کیا گیا۔ ڈبلن میں اس کا شاندار استقبال ہوا کہ لوگوں نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ رہائی کے بعد وہ تندہی سے سیاسی امور میں حصہ لینے لگا اور اس کی حیثیت ایک پختہ مدبر کی سمجھی جانے لگی۔

۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں وہ نہایت اکثریت سے سن فین پارٹی کا پارلیمنٹ میں ممبر چنا گیا۔ اسے اس وقت احساس ہوا۔ کہ انگلستان سے وفاداری کا حلف اور آئرلینڈ سے جانثاری دو متضاد

چپیں ہیں۔ اسی سال وہ سن فین پارٹی کا صدر منتخب ہوا۔ مئی ۱۹۱۸ء میں اسے مع اس کے ساتھیوں کے گرفتار کیا گیا۔ پہلے اسے ویلز کی جیل اور جیل خانہ لنکن میں رکھا گیا۔ اس کی گرفتاری کی وجہ یہ تھی۔ کہ حکومت لڑائی کے لئے جبری بھرتی کرنا چاہتی تھی اور یہ اس کے خلاف تھا۔ ۱۹۱۸ء کا موسم بہار اتحادیوں کی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی۔ فیلڈ مارشل ہیگ مزید فوجوں کے لئے مطالبہ کر رہے تھے۔ اور لوگ بھرتی ہونے سے منحرف تھے۔ انگلستان سے سب نوجوان بھرتی ہو چکے تھے آئرلینڈ میں لوگوں کا خیال تھا۔ کہ ملک کے اندر رہ کر ستم اور مصائب جھیلنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ کہ آدمی میدان کارزار میں جا کر گولی کا نشانہ بنے۔ ڈی ویلرا کے نام سے لوگوں کو تسکین ہوتی۔ وہ برملا کہتے۔ ہمیں کیوں اس میدان میں قربانی کے لئے لے جا رہے ہو۔ جہاں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔

جنوری ۱۹۱۹ء میں آئرش پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ بہت کم ممبروں نے شمولیت کی۔ اس لئے کہ بعض تو جیل میں بند تھے۔ اور بعض جان کے خطرہ کی وجہ سے بھاگ گئے۔ حکومت سے باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ لوگوں نے سپاہیوں اور فوجیوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ فوجی عمارتیں جلائی گئیں۔ اس خطرناک حالت میں جب کہ لوگ خائف تھے۔ کہ اب کیا ہوگا۔ ڈی ویلرا جیل خانہ لنکن سے بھاگ کر موقع پر پہنچ گیا۔ وہ ہفتوں مختلف مقامات پر چھپا پھرتا۔ اور جب پارلیمنٹ میں قوم نے متفقہ طور پر دریافت کیا کہ ڈی ویلرا کہاں ہے۔ تو مائیکل کالن نے اپنی طرف سے ایک پیغام بنا کر پڑھ دیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ میں جیل سے بھاگ کر قوم کی خدمت میں مصروف ہوں۔

انگریزی حکومت سے مدافعت کے لئے روپیہ کی اشد ضرورت تھی۔ ڈی ویلرا تختہ جہاز پر چھپ کر امریکہ جا پہنچا وہاں سے اسے روپیہ لانے میں گونہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس زمانہ میں

آئرلینڈ کی ناگفتہ بہ حالت تھی۔ لوگوں پر عجیب نوعیت کے ظلم و ستم ڈھائے جا رہے تھے۔ جب جنگ عظیم کی صلح کے عہدنامہ پر دستخط ہوئے تو ڈی ویلرا لائڈ جارج سے گفت و شنید کے لئے لنڈن پہنچے۔

ڈی ویلرا نے ان نمائندوں سے جو اس کے ہمراہ صلح کی گفت و شنید کے لئے لنڈن گئے تھے۔ برملا کہہ دیا۔ کہ اگر انھوں نے آئرلینڈ کے مفاد کے خلاف کسی عہدنامہ پر دستخط کئے تو وہ اسے کسی طور پر بھی تسلیم نہیں کریگا۔ ایسا ہی ہوا جیسا کہ اس کا خیال تھا۔ گرفتھ نے انگریزی حکومت سے ایک عہدنامہ کیا جو آزادی کے نقطہ نگاہ سے نامکمل اور بیہودہ تھا۔ لیکن عوام کی ہمدردی عہدنامہ کے حق میں تھی۔ اس لئے گرفتھ ان کی جگہ صدر مقرر ہوا۔ اور عہدنامہ قبول کیا گیا۔

جب ڈی ویلرا نے عہدنامہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ تو اس کے خیال میں صرف ایک بات تھی۔ کہ اس کی قوم آزاد قوموں کی صف میں عزت کے ساتھ کھڑی ہو سکے۔ اسے اس کی قطعاً پروا نہ تھی۔ کہ چند آدمیوں کو معزز عہدے دیئے جائیں گے۔ آخر لوگ اس کے زاویہ نگاہ سے متاثر ہوئے۔ اور جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو وہ بطور والنٹیئر کے جمہوری فوجوں میں شامل ہو گیا۔ اس کی زندگی کے یہ ایام نہایت تلخ تھے۔ تاہم جس صبر۔ ایثار۔ جانفشانی۔ محنت اور حوصلہ کے ساتھ اس نے ملک کی ڈوبتی ناؤ کو بچایا۔ آج اسے زمانہ دیکھ رہا ہے۔ وہ ملک کا صرف نامور لیڈر۔ صدر اور راہنما ہی نہیں بلکہ لوگ اس کی بجائے باپ کے تعظیم کرتے ہیں۔



ڈاکٹر سر محمد اقبال

کیٹس نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ اولو العزم ہستیاں کسی خاص ملک یا گروہ سے تعلق نہیں رکھتیں۔ وہ تمام دنیا کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہیں۔ اور تمام دنیا کے لئے پیغام لاتی ہیں۔ اُن کا کام دنیا کے سربستہ راز کو کھولنا ہوتا ہے۔ اور یہ دانائے رازِ سرِ نہاں کو منکشف کر کے ہمیشہ کے لئے ابدی راز کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال شعر کا پیغمبر اور اقلیم سخن کا شہنشاہ ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو صبح کے پانچ بجے اپنی موت سے چند گھنٹے پیشتر یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیم از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

رموزِ انسانیت کے ایک بہت بڑے راز داں کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ آنے والی نسلیں اُن کا کلام پڑھ کر سر دھنیں گیں۔ ان کی روح کے استقبال کے لئے جامی۔ رومی۔ نظیری۔ علی ابن سینا۔ رازی اور غالب کی آنکھیں بچھیں گی۔ دنیا ہمیشہ ان کا ماتم کریگی۔ اور شاید صدیوں گذرنے پر بھی دگر دانائے راز پیدا نہ کر سکے۔

بے شک آج اس کی موت سے شعر و شاعری۔ علم و فضل۔ فلسفہ اور تصوف کی تمام محفلوں میں اندھیرا چھا چکا ہے۔ مگر اس کی روح اپنے بلند تخیل سے ہمیشہ کے لئے دنیا کو مضطرب رکھے گی۔

بقول سر عبدالقادرؒ کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا۔ جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی رُوح پھُونک دیگا۔ اس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز پھر وجود میں آئیں گے اور اردو ادب کے فروغ کا باعث ہونگے۔ مگر زبانِ اردو کی خوش اقبالی دیکھئے کہ اس زمانہ میں اقبال جیسا شاعر اسے نصیب ہوا۔ جس کے کلام کا سکہ دنیا بھر کے اردو دان انسانوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور جس کی شہرت روم و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ چکی ہے"۔

"غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا۔ اس نے ان کی رُوح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے"۔ یہ بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ قدرت نے میر اور غالب کو اقبال کی ذات میں جمع کر دیا۔

شاعر مشرق ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ علم کے ابتدائی منازل سکاچ مشن سکول سے طے کر کے سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ وہاں مولانا سید میر حسن جیسے قابل، سخن شناس عالم، متبحر اور شفیق استاد کی آغوش میں پھلے پھولے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں لکچرار مقرر کئے گئے۔ انہی ایام میں آپ نے ایک کتاب اردو میں "علم الاقتصاد" لکھی۔ کچھ عرصہ بعد آپ سرکاری وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ وہاں سے آپ جرمنی پہنچے اور وہیں سے ڈاکٹر اور فلاسفی کی ڈگری فلسفۂ ایران لکھ کر حاصل کی۔ بعد میں کچھ عرصہ تک لنڈن یونیورسٹی میں عربی کے لکچرار رہے۔

انگلستان میں آپ نے بہت سی فارسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ فارسی میں آپ کو جس قدر دخل حاصل ہوا وہ آپ کی کتابوں سے صاف عیاں ہے۔ آپ کے زمانہ طالب علمی میں بمقام سیالکوٹ ایک چھوٹا سا مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ جس کے لئے آپ کبھی کبھی غزل لکھا کرتے تھے۔ انہی ایام میں نواب مرزا خان صاحب داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا۔ اقبال نے اپنی غزلیں بغرض اصلاح ان کے پاس بذریعہ ڈاک بھیجیں چنانچہ ان میں استاد شاگرد کا رشتہ پیدا ہو گیا۔ سر عبدالقادر رقمطراز ہیں۔ کہ "اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا۔ کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے۔ کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے۔ جن لوگوں کے کلام کی اصلاح کی ہے۔ مجھے دکن میں خود اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔"

اقبال کو خوش قسمتی سے علمی منازل طے کرنے کے لئے نہایت لائق اور شفیق استادوں سے واسطہ پڑا۔ مولوی میر حسن صاحب کے نام نامی کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کیمبرج میں ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، براؤن۔ نکلسن اور سارلی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن نے آپ کی کتاب اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کر کے علم ادب کی ایک نہایت اعلیٰ خدمت کی ہے۔

فروری ۱۸۹۹ء میں آپ کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ آغاز میں یہ چرچا صرف طلباء تک ہی محدود تھا۔ بانگِ درا کے نام سے آپ کا اردو کلام چھپ چکا ہے۔ مگر جو غزلیں آپ نے اوائل عمر میں لکھی تھیں۔ وہ اس مجموعہ میں نہیں رکھی گئیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسہ میں مرزا ارشد گورگانی مرحوم موجود تھے۔ آپ نے ایک نظم پڑھی۔ جب اس شعر پر پہنچے تو مرزا مرحوم پھڑک اٹھے اور بولے "میاں اقبال اس عمر میں یہ شعر" ؎

ڈاکٹر سر محمد اقبال

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

۱۸۹۷ء میں آپ نے "نالہ یتیم" کے نام سے ایک نظم انجمن مذکور میں پھر پڑھی جس سے آپ کی دھاک ملک کے گوشہ گوشہ میں بیٹھ گئی۔ ہندوستان ہمارا - ہمالہ اور ترانۂ ملی کے نام سے وہ نظمیں لکھیں کہ پڑھنے والے کے دل میں ایک تڑپ پیدا کر دیتی ہیں ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستان

چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اور جس سادگی سے ہمالہ سے درخواست کی ہے۔ کہ وہ کوئی اگلے وقتوں کی داستان شاعر سے کہے وہ انہی کا حصہ ہے ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

پھر وطن کی محبت سے مجبور ہو کر بیساختہ بول اٹھتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ملکی تعصب اور کشمکش سے تنگ آکر کہتے ہیں

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

انہیں یقین ہے۔ کہ ہندوستان کے تمام نقائص تھوڑی سی جدوجہد سے دُور ہو سکتے ہیں
خودی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ بغیر خودی کے دُنیا میں زندہ رہنا بے معنی ہے اور
خودی کی تعلیم دیتے وقت وہ بس طور پر یہ خوشخبری دیتے ہیں

فرد ہر جا کہ بر زد آسماں بود ۔ ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود
کرانِ بیکران دامن جہاں بود ۔ و لیکن چوں بخود نگریستم من

شاعر مرحوم کی شاعری نے مشرق کی آنکھیں کھول دیں وہ درحقیقت مشرق کی روح کا ایک
بڑا بیاض تھا۔ اس نے اپنے بلند تخیل میں مشرق کی روح کو خوب پہچانا اور اقوام عالم کو مشرق کا پیغام دیا۔
ان کا خیال ہے۔ کہ اگرچہ ہندوستان پر اس قدر انقلابات آئے۔ اس قدر مصائب کے
دُور سے گذرنا پڑا۔ تاہم وہ ابدالآباد تک قائم رہے گا ؎

ایران و مصر و روما دنیا سے مٹ گئے ہیں
اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا

ٹرکی کے مشہور شاعر حسین دانش نے مرحوم کی بہت سی نظموں کا ترجمہ ٹرکی زبان میں کیا ہے۔
جو وہاں بہت مقبول ہیں اور پیامِ مشرق پر انہوں نے ایک بسیط مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔

اقبال کی سب نظمیں تخیل زبان اور بیان کے لحاظ سے نہایت رنگین۔ دلآویز۔ اعلیٰ اور ارفع
ہیں بعض نظمیں انگریزی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً "ہمدردی" کوپر کی ایک نظم کے تتبع میں ہے۔
"پیامِ صبح" میں لونگ فیلو کی پیروی کی گئی ہے۔ "عشق اور موت" پر ٹینیسن کا اثر ہے۔ "رخصت اے بزمِ
جہاں" اور "ایک پہاڑ اور گلہری" میں ایمرسن کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن زبان و بیان کی لطافت۔

استعارات ۔ رنگینیٔ خیالات کا زور اور نزاکت کے لحاظ سے یہ نظمیں خالص مشرقی ہیں ۔ اور زبان و مکان کی حدود سے آزاد ہیں ۔ اس کے پڑھنے والوں کو سرود و نشاط کی ایک غیر محدود کیفیت ایسی بے خود کر دیتی ہے ۔ تاہم انہیں خود اس بات کا اعتراف تھا ۔ کہ اردو میں ابھی وہ روانی پیدا نہیں ہوئی ۔ ان کی آرزو تھی ۔ کہ ہندوستان میں قومیت کا پودا پروان چڑھے اور اس کی ایک ایسی زبان ہو جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جائے ۔ اِس بات سے متاثر ہو کر انہوں نے لکھا ہے

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیٔ پروانہ ہے

پھر بھلا کیسے ممکن تھا ۔ کہ اس اولوالعزم خیالات کی متحمل اردو زبان ہو سکتی ۔ چنانچہ انہیں خیال پیدا ہوا ۔ کہ اردو میں اتنی وسعت اور پختگی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اس کے ذریعے اپنے فلسفیانہ خیالات ظاہر کر سکیں ۔ علاوہ بریں ان کو تمام دُنیا کو پیغام دینا تھا ۔ اِس لئے انہوں نے فارسی کو خطاب کا ذریعہ تجویز کیا ۔ اب تک ان کی فارسی کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ اسرار خودی ۔ رموز بیخودی پیام مشرق ۔ زبور عجم اور جاوید نامہ ۔ ان سب کتابوں میں ایک ہی افسوں ہے اور اسے شعر کے پیغمبر کی صدا کہنا نامناسب نہ ہوگا ۔

جب اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی زبان میں نکلا ۔ تو مسٹر ہربرٹ ریڈ نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا "اقبال کی نظموں پر والٹ وہیٹمن کے فلسفۂ اقدام و عمل کا اثر پڑا ہے ۔ وہیٹمن کا نصب العین نظری ہے ۔ دنیا میں صرف ایک شاعر ایسا ہے ۔ جس کے ہاں یہ چیز نظر آتی ہے ۔ اور میری مراد محمد اقبال سے ہے ۔ جن کی کتاب اِسرار خودی کا ترجمہ نکلسن نے کیا ہے ۔ ہمارے ملک کے شاعر کیٹس کے نقشِ قدم

پر چلنا ایک بہت بڑی بات سمجھتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے موضوعوں پر نظمیں لکھ رہے ہیں۔ بلبلوں اور پرندوں کو مخاطب کر رہے ہیں۔ مگر مشرق میں اقبال کی آتش نفسی نے مردوں کو زندہ کر دیا ہے۔"

اقبال نے اسرار و رموز میں گوہر ہائے آبدار کی ایسی لڑیاں پروئی ہیں۔ کہ بجائے دماغ کے دل پر اثر ہوتا ہے۔ وہ کس خوبصورتی سے کہتا ہے ؎

اِنتظار صبح خیزاں می کشم　　اے خوشا زرتشتیاں آتشم

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم　　من نوائے شاعر فرداستم

ایرانیوں کے طریقہ پر ساقی سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے ؎

خیز دد رجامم شرابِ ناب ریز　　بر شب اندیشہ ام مہتاب ریز

تا سوئے منزل کشم آوارہ را　　ذوقِ بے تابی دہم نظارہ را

گرم رو از جستجوئے نو شوم　　روشناسِ آرزوئے نو شوم

وہ معترف ہے۔ کہ مولانا جلال الدین رومی نے مجھے راہِ ہدایت پر گامزن کیا ہے۔ اور کس شان سے کہتا ہے ؎

شب دلِ من مائلِ فریاد بود　　خامشی از یارب ہم آباد بود

شکوہ آشوبِ غمِ دوراں بُدم　　از تہی پیمانگی نالاں بُدم

از پئے نظارہ ام بیتاب شد　　بال و پر بشکست و آخر خواب شد

روئے خود بنمود پیر حق سرشت　　کو بحرف پہلوئے قرآں نوشت

مگر اسرار میں وہ رقمطراز ہیں ؎

بازبرخوانم زفیضِ پیرِ روم | دفترِ سربستہ اسرارِ علوم
جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار | من فروغِ یک نفس مثلِ شرار
شمع سوزاں تاخت بر پروانہ ام | بادۂ شبخون ریخت بر پیمانہ ام
پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد | از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد۔

اقبالؔ کا طرزِ تحریر مولانا روم کا ہے۔ لیکن اس کے الفاظ ایسے ہیں۔ جیسے مرصع کاری کی ہے۔ نو بیدارِ مشرق کی روح ایک ترجمانِ حقیقی کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اس کی شاعری نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اس نے ایران کی شاعری کی رگوں میں نیا خون پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ وقت قریب آنے والا ہے۔ جب کہ اس چٹان سے ایک نیا کوثر پھوٹ بہے گا۔ جس پر اقبال نے اپنے عصا سے ایک ضربِ کاری لگائی تھی۔

